قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً (رواہ البخاری)

سلسلہ ۴۱ — بار اوّل ۳۰۰۰

اَلْبَابُ

لِاُولِی الْاَلْبَابِ

(عقلمندوں کے لئے ہدایت کا دروازہ)

از افادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات وحواشی

مولانا خلیل احمد تھانوی

ناشر:۔ شعبۂ نشر واشاعت جامعہ دار العلوم الاسلامیہ

کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

فون پرانی انارکلی: ۷۳۵۳۷۲۸ — فون کامران بلاک:۔ ۵۴۱۴۳۸۶، ۴۳۸۰۶۰

جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ — نومبر ۱۹۹۶ء

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ (رجسٹرڈ)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ایماء پر قاری سراج احمدؒ کی قائم کردہ دینی کی وہ عظیم درس گاہ ہے جو ۱۹۴۸ء سے مصروف خدمت ہے۔

اب یہاں الحمدللہ تجوید و قراءات کے ساتھ دورہ حدیث تک وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب کے مطابق تعلیم ہورہی ہے۔ ادارہ کے نصاب تعلیم کو وفاق المدارس کے نصاب میں اس طرح مدغم کیا گیا ہے کہ طالب علم ثانویہ عامہ کے پہلے سال میں تجوید کی روایت حفصؒ مکمل کرلے، ثانویہ خاصہ کے سال دوم کے اختتام پر اس کی سبعہ قراءات مکمل ہوجائیں اور عالیہ کے دو سالوں میں عشرہ قراءات مکمل کرلے۔ اس کے بعد عالمیہ (دورہ حدیث) کا نصاب مکمل کرکے ایک طرف مکمل عالم بنے تو ساتھ ہی عشرہ کا بہترین قاری بھی ہو اور اس کو مدرسہ کی اسناد قراءات کے ساتھ وفاق المدارس کی سندات بھی مل جائیں۔

طلباء کو نظام الاوقات کا پابند کیا گیا ہے۔ جس میں ہر کام کے لیے وقت مقرر ہے۔ سونے، جاگنے، پڑھنے، کھانے، کھیلنے اور نماز کے اوقات متعین ہیں۔

طلباء کا داخلہ انٹرویو کے ذریعہ ہوتا ہے ششماہی اور سالانہ امتحانات تحریری لیے جاتے ہیں نیز سالانہ امتحان وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام ہوتا ہے۔

درس نظامی متوسطہ سے دورہ حدیث تک، حفظ و ناظرہ تجوید و قراءات سبعہ و عشرہ، سکول کی مڈل تک تعلیم اور تحقیق و تصنیف نیز انتظامی امور کے لیے (۷۷) افراد کا عملہ مصروف خدمت ہے۔

طلباء کی تعداد حفظ و ناظرہ کے درجات میں (۴۴۸) اور درس نظامی متوسطہ سے دورہ حدیث تک نیز قراءات سبعہ و عشرہ اور تجوید للعلماء میں (۲۶۵) اس طرح تعداد (۷۱۳) زیر تعلیم ہے۔

ان میں سے ۴۰۰ طلباء کے قیام و طعام، نقد وظیفہ، درسی کتب مہیا کرنے اور علاج معالجہ کی سہولت کی ذمہ داری دارالعلوم پر ہے۔

الحمدللہ درس نظامی کے سال اول سے اوپر تک تمام درجات کے اکثر طلباء حافظ قرآن ہیں۔

جامعہ کی طرف سے ہر ماہ دینی معلومات پر مشتمل حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا ایک وعظ یا علماء دیوبند کا کوئی ایک کتابچہ شائع کرکے مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔

ادارہ اشرف التحقیق میں حضرت مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ اور ان کے ہمراہ چار ماہر علماء احکام القرآن کی تدوین کا کام مکمل کرچکے ہیں اور حضرت مفتی صاحبؒ کے وصال کے بعد سے تین علماء جمیل الفتاویٰ اور بعض دوسرے تحقیقی مسائل کی تدوین و ترتیب میں مصروف ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمد عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ولیس البر بأن تأتوا البیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقی وأتو البیوت من ابوابھا واتقو اللہ لعلکم تفلحون[۱]۔

(یہ کوئی نیک کام نہیں کہ تم گھروں کے پچھواڑے آیا کرو لیکن نیک کام یہ ہے کہ آدمی تقویٰ اختیار کرے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب رہو)۔

تمہید

یہ ایک طویل آیت کا ٹکڑا ہے اس میں ایک خاص واقعہ کے متعلق حق نے خاص حکم ارشاد فرمایا ہے۔ اس سے مجھ کو ایک ضروری مضمون مستنبط[۲] کرتا ہے جس کی ضرورت عنقریب واضح ہوجائے گی وہ مضمون ایک تفسیر پر تو آیت کا مدلول[۳] بھی ہے بوجہ عموم الفاظ کے اور ایک تفسیر پر مستنبط ہے۔ پہلے واقعہ سن لیجیے تاکہ فہم مطلب میں سہولت[۴] ہوجائے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگوں کی عادت تھی کہ وہ حالت احرام میں اپنے گھروں کے اندر دروازہ سے

۱۔ البقرۃ آیت: ۱۹۰ ۔ ۲۔ ضروری مضمون کا حکم نکالتا ہے

۳۔ آیت اس مضمون پر دلالت کرتی ہے ۔ ۴۔ مطلب سمجھنے میں آسانی ہوجائے

نہیں داخل ہوتے تھے بلکہ دیوار پھاند کر یا دیوار میں سوراخ کر کے آتے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ احرام تمتعات[۱] سے مانع ہے چنانچہ شریعت اسلامیہ نے بھی بعض تمتعات سے حالت احرام میں منع کردیا ہے کہ خوشبو لگانا، سلے ہوئے کپڑے پہننا، سرڈھانکنا، بال مونڈنا، خط بنانا، بیوی کے پاس جانا محرم[۲] کو ناجائز ہے۔ اہل جاہلیت نے بطور غلو کے یہ سمجھا کہ جب احرام تمتعات سے مانع[۳] ہے تو اس کا مقتضا[۴] یہ ہے کہ گھر میں بھی نہ جائے بلکہ کھلے میدان میں رہے۔ کیونکہ گھر میں جانا اور محفوظ جگہ رہنا بھی ایک تمتع ہے۔ اور اگر کسی کو بہت ہی ضرورت گھر میں جانے کی ہو تو عادت کے خلاف کسی اور طریقہ سے جائے خواہ دیوار پھاند کر یا دیوار میں نقب[۵] دے کر۔ تاکہ اگر ترک کامل نہ ہو تو جہت معتادہ کا تو ترک[۶] ہوجائے کہ یہ بھی فی الجملہ ترک تمتع[۷] ہے۔ جاہلیت کے افعال کی وجہ بیان کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ اگر ان کے افعال کے لیے وجود معقولہ ہوا کرتے تو وہ افعال جاہلیت ہی کیوں کہلاتے لیکن اگر کسی فعل کی وجہ معلوم ہوجائے جو ان کے ذہن میں وجہ تھی گو واقعہ میں وجہ بننے کے قابل نہ ہو تو اس کا بیان کردینا مناسب ہے کیونکہ وجہ بتلادینے سے اس کا جاہلیت ہونا زیادہ واضح ہوجاتا ہے۔ بعض دفعہ وجہ نہ بیان کرنے سے مخاطب کے ذہن میں اس فعل کی وقعت رہ سکتی ہے کہ نہ معلوم اس فعل کی کیا وجہ ہوگی شاید کوئی معقول وجہ ہو اور بیان کردینے کے بعد وہ وقعت[۸] زائل ہوجاتی ہے اور ہر شخص کو وجہ نا معقول ہوجانے کے بعد اس کا جاہلیت ہونا واضح ہوجاتا ہے۔ بہر حال ان کا خیال یہ تھا کہ

۱۔ دنیوی فوائد اٹھانے سے روکتا ہے ۲۔ احرام والے کو
۳۔ احرام فائدے اٹھانے سے روکنے والا ہے ۴۔ تقاضا ۵۔ سوراخ کر کے
۶۔ مکمل طور پر نہ چھوڑا جائے تو کم از کم جو عام طریقہ سے گھر میں داخل ہونے کا راستہ تو چھوڑ دے
۷۔ یہ بھی نفع کا چھوڑنا ہی ہے ۸۔ اہمیت

دروازہ سے گھر میں آنا حالت احرام میں خلاف برّ اور خلاف تعبد و تقرب[۱] ہے اور جب یہ صورت خلاف برّ[۲] ہے تو اس کی خلاف صورت داخل بر[۳] ہوئی اور اگر برّ نہ ہو تو احتمال بر تو ہے۔ پس اس مسئلہ میں ان لوگوں نے دو غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ ایک یہ کہ بحالت احرام دروازہ سے گھر میں آنا جائز تھا اس کو حرام سمجھا۔ دوسرے یہ کہ دیوار پھاند کر یا نقب دے کر آنا باعث ثواب نہ تھا اس کو ان لوگوں نے باعث ثواب سمجھا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس کی نفی[۴] اس آیت میں فرمائی "ولیس البر بان تاتوالبیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقی"۔ یعنی یہ کوئی نیک کام نہیں کہ تم گھروں میں پچھواڑے سے آیا کرو۔ ہاں! لیکن نیک کام یہ ہے کہ آدمی (ناجائز امور سے، تقویٰ اختیار کرے اور دروازہ سے آنا ناجائز نہیں تو اس سے بچنا تقویٰ میں داخل نہیں) "ولکن البر من اتقی" (لیکن نیک کام یہ ہے کہ آدمی تقویٰ اختیار کرے) دو توجیہیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ جانب خبر میں مضاف مقدر مانا جاوے یعنی "لکن البر من اتقی" (کہ نیکی اس شخص کی نیکی کو کہہ سکتے ہیں جو تقویٰ اختیار کرے) دوسرے یہ کہ جانب اسم میں مضاف مقدر ہو یعنی "ولکنّ ذا البر من اتقی" اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا لیکن نیک کام کرنے والا وہ ہے جو متقی ہو۔ اور حذف مضاف میں اس جگہ نکتہ یہ ہے کہ بطور مبالغہ کے یہ بتلانا ہے کہ برّ اور متقی گویا متحد ہیں جیسے زید عدل اور یہ محاورہ ہماری زبان میں بھی ہے چنانچہ بولتے ہیں کہ فلاں شخص سراپا اخلاق ہے، سراپا کرم ہے۔ اسی طرح محاورہ عرب میں بھی اطلاق مصدر کا ذات پر مبالغۃً ہوتا ہے جیسا اس آیت میں ہے "ولکن البر من اتقی" یعنی سراپا برّ وہ ہے جو متقی ہو۔ آگے

۱۔ نیکی عبادت اور قرب الٰہی کے خلاف ہے ۲۔ نیکی
۳۔ تو اس کی مخالف صورت نیکی میں داخل ہوئی ۴۔ انکار اس آیت میں کیا

بطور تفریع کے فرماتے ہیں کہ جب تقویٰ بر ہے تو اس کا مقتضا یہ ہے کہ بدعات جاہلیت سے بچا جائے اور اہل جاہلیت کی طرح اپنی طرف سے کسی کام کو طاعت یا معصیت[1] نہ قرار دیا جائے "وأتوا البیوت من ابوابها" اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو۔ "واتقوالله لعلکم تفلحون". اور خدا سے ڈرتے رہو (یعنی تقویٰ اختیار کرو) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ "واتقوالله" (اللہ سے ڈرتے رہو) میں تقویٰ عملی اور اعتقادی دونوں کا امر ہے یعنی نہ اپنے عمل سے کسی جائز کام کو ناجائز اور مباح[2] کو طاعت ظاہر کرو نہ اعتقاداً ایسا سمجھو بلکہ عمل اور اعتقاد دونوں کو حکم الٰہی کا تابع بناؤ۔ کہ حرام اسی کو سمجھو جس کو خدا نے حرام کیا ہے اور طاعت بھی اسی کو سمجھو جس کو خدا نے طاعت کہا ہے اپنی طرف سے طاعات و محرمات ایجاد نہ کرو۔

عادت اور عبادت دونوں کا تعلق دین سے ہے

اس آیت سے ایک بات کام کی معلوم ہوئی وہ یہ کہ گو گھر میں دراوزہ سے جانا یا پشت کی طرف سے آنا عبادات میں سے نہیں ہے بلکہ گھر میں دروازہ سے آنا محض عادات میں سے ہے اور پشت کی طرف سے آنا عادت کے خلاف ہے لیکن اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس عادت سے بھی تعرض[3] فرمایا ہے کیونکہ لوگوں نے حالت احرام میں عادت قدیمہ[4] کو ناجائز اور اس کی مخالفت کو ثواب سمجھ لیا تھا حق تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا جس کا حاصل یہ کہ تم بلا دلیل شرعی کے کسی عادت کو حرام اور اس کی مخالفت کو ثواب کا کام نہ سمجھو اس سے معلوم ہوا کہ دین کا تعلق عادات و عبادات دونوں سے ہے اور شریعت دونوں میں تصرف کرتی

۱- نیکی یا بدی   ۲- اور جائز کو عبادت
۳- حق تعالیٰ نے اس عبادت کا بھی حکم فرمایا   ۴- پرانی عادت

ہے خواہ یہی حکم دیدے کہ یہ عادت جائز ہے کیونکہ مباح کا مباح[1] ہونا یہ بھی ایک حکم شرعی ہے اور کسی امر کو مباح کرنا بھی ایک قسم کا تصرف ہے۔

چنانچہ جو لوگ کسی سلطنت کی رعایا بن کر رہتے ہیں وہ اس راز کو خوب سمجھتے ہیں کہ سلطنت بعض امور سے منع کرتی ہے اور بعض امور کی اجازت دیتی ہے جس طرح کسی امر سے منع کرنا تصرف ہے اسی طرح یہ بھی تصرف اور دست اندازی ہے کہ اس نے بعض چیزوں کی اجازت دی ہے اب اگر کوئی شخص کسی کو ایسے کام سے روکنے لگے جس کی قانوناً اجازت ہے تو وہ اس پر دعویٰ کرسکتا ہے۔ یا اگر کوئی شخص قانون میں ایک دفعہ زیادہ کرکے ان امور مباحہ[2] کو ممنوع قرار دیدے تو خود سلطنت اس سے مواخذہ کرتی ہے کہ جس چیز کی ہم نے اجازت دی ہے تم نے اس کو ممنوع کیوں قرار دیا ہے۔

بعض دفعہ پولیس کسی کی تلاشی لیتی ہے تو بعض کو تو سزا ہوجاتی ہے اور بعض کو چھوڑ دیتی ہے تو جس طرح سزا کرنا ایک تصرف ہے اسی طرح چھوڑ دینا بھی تصرف ہے۔ جب دنیوی سلطنت کا یہ حال ہے کہ اس کو تصرف اباحات کا بھی حق ہے تو حق تعالیٰ کو تصرف اباحت کا کیوں حق نہ ہوگا؟ ضرور ہونا چاہیے۔

انسان اپنے دنیوی کاموں میں بھی بالکل آزاد نہیں

پس دین کا تعلق عبادات و عادات دونوں سے ہے اب چاہے وہ بعض عادات کو مباح ہی کردے یہ بھی اس کا ایک تصرف ہے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ شریعت کو امور دنیوی سے اور عادات الناس[3] سے کیا تعلق، شریعت کو محض عبادات سے بحث کرنی چاہیے مگر یہ خیال غلط ہے کیونکہ اس میں در پردہ

۱۔ جائز کا جائز ہونا ۲۔ جائز کاموں ۳۔ لوگوں کی عادتوں

حق تعالیٰ کے وسعت اختیارات پر اعتراض ہے کہ خدا تعالیٰ کے اختیارات اتنے وسیع نہ ہونے چاہیں کہ ہماری عادات میں بھی دخل دیں اور زندقہ[1] ہونا بدیہی ہے۔ لوگوں نے ایک حدیث یاد کر رکھی ہے "انتم اعلم بامور دنیاکم" (یعنی حضور ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ سے فرمایا کہ دنیوی امور کو تم خود زیادہ جانتے ہو) اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی کاموں سے رسول اللہ ﷺ کو کچھ واسطہ نہیں ہم ان کو خود زیادہ جانتے ہیں۔ میں اس دلیل کا بھی جواب دینا چاہتا ہوں اور وہ جواب خود اسی حدیث کے اندر موجود ہے مگر لوگ حدیث کے الفاظ میں غور نہیں کرتے اس لیے اشکال پڑجاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ نے اس جگہ بھی تو فرمایا ہے کہ تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔ یہ تو نہیں فرمایا کہ تم دنیوی امور میں خود مختار ہو کہ جو چاہو کرو۔ پس ثبوت علم سے ثبوت اختیار کیونکر لازم آگیا ذرا اس کی دلیل تو بیان کیجیے۔

دیکھیے اگر کوئی حاکم کسی کاریگر لوہار سے یہ کہے کہ بھائی ہتھیار بنانا تم ہم سے زیادہ جانتے ہو تو کیا اس کا یہ مطلب ہوا کرتا ہے کہ تم ہتھیاروں کے بارہ میں بالکل آزاد ہو کہ جس کو چاہو ہتھیار بنا کر دیدیا کرو۔ خواہ اس کے پاس لائیسنس ہو یا نہ ہو۔ یا جو ہتھیار چاہو بنالیا کرو چاہے قانوناً اس کی اجازت ہو یا نہ ہو۔ ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ حاکم کے اس قول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس حدیث میں صرف اتنی بات ہے کہ دنیوی کاموں کا طریقہ اور ان کے آثار و خواص لوگوں کو زیادہ معلوم ہیں اور یہ بات اس حدیث میں کہاں ہے کہ دنیوی کاموں میں لوگ بالکل آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں کسی کام سے ان کو نہ روکا جائے گا کہاں اعلمیت[2] اور کہاں تخییر[3] علم سے اختیار کیونکر نکل آیا بلکہ اختیار کی نفی

۱- باطنی کفر ہونا ظاہر ہے ۲- زیادہ جاننا ۳- خود مختار ہونا

دوسری نصوص[1] میں صراحتہً مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ جو چاہیں کیا کریں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "وربک یخلق ما یشاء ویختار"[2]۔ (اور آپ کا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے اختیار کرتا ہے) یعنی جس طرح صفت خلق[3] میں کوئی اس کا شریک نہیں اسی طرح صفت اختیار میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہاں اختیار تکوینی مراد ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ "یخلق مایشاء" (جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے) سے اختیار تکوینی خود ظاہر ہے۔ اگر "یختار" سے بھی اختیار تکوینی[4] مراد ہوتا تو "یخلق مایشاء" کے بعد اس کی ضرورت ہی کیا تھی معلوم ہوا کہ اختیار تشریعی[5] مراد ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں "ماکان لھم الخیرۃ"۔ بندوں کے لیے کچھ اختیار نہیں چونکہ اوپر "یختار" میں اختیار شرعی کا مراد ہونا متعین ہو چکا ہے اس لیے "ماکان لھم الخیرۃ"۔ (ان کو کچھ اختیار نہیں ہے) میں بھی اس کی نفی مراد ہونی چاہیئے اس صورت میں لام تعریف عہد کے لیے ہوگا۔ اور اگر لام جنس[6] کے لیے مانا جاوے تو عموم کی وجہ سے ہر اختیار کی نفی ہو جاوے گی معنیٰ یہ ہوں گے کہ اختیار تکوینی اور تشریعی دونوں خدا کے لیے مخصوص ہیں کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں نہ تشریعی نہ تکوینی آگے فرماتے ہیں۔ "سبحان اللہ وتعالیٰ عما یشرکون" یعنی خدا تعالیٰ شرک تکوینی اور تشریعی دونوں سے پاک ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے "الا لہ الخلق والامر"[7]۔ یعنی خدا ہی کے لیے ہے خالقیت و آمریت[8] یہ آیت تو بہت

۱۔ دوسری احادیث میں واضح طور پر مذکور ہے ۲۔ القصص آیت: ۶۸ ۳۔ صفت پیدائش
۴۔ عدم سے وجود میں ۵۔ احکام مقرر کرنے کا اختیار
۶۔ لام تعریف کی چار قسمیں ہیں (ا) عہد ذہنی (ب) عہد خارجی (ج) جنسی (د) استغراق
۷۔ الاعراف آیت: ۵۴ ۸۔ پیدا کرنا اور حکم دینا

زیادہ صریح ہے کیونکہ اس میں اختیار تکوینی کا احتمال بھی نہیں کیونکہ امر کا اطلاق جبکہ خلق کے مقابلہ میں ہے شریعت میں امر تشریعی ہی پر ہوا کرتا ہے امر کے معنی حکم کرنے کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کے سوا حکم کرنے والا اور احکام مقرر کرنے والا کوئی نہیں خلق سے اختیار تکوین اور امر سے اختیار تشریعی مراد ہے اور ان دونوں کو بصورت حصر خدا کے لیے ثابت کیا گیا ہے جس سے دونوں کی نفی ماسوا[۱] سے لازم آگئی۔

عالم خلق اور عالم امر کی تفصیل

اور یہاں میں ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں نے اس آیت سے عالم مجردات کے وجود پر دلیل قائم کی ہے۔ عالم مجردات کو صوفیہ کی اصطلاح میں عالم امر بھی کہا جاتا ہے اس لیے "الا لہ الخلق والامر" (خدا ہی کے لیے خالقیت و آمریت ہے) سے لوگوں کو دھوکہ ہوا اور انہوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ خدا ہی کے لیے ہے عالم خلق و عالم[۲] امر۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ قرآن کے مخاطب اول اہل عرب تھے اور وہ عالم امر کو جانتے بھی نہ تھے۔ یہ اصطلاح بعد میں حادث[۳] ہوئی نزول قرآن کے وقت عالم امر کو کوئی جانتا بھی نہ تھا مگر لوگوں کی عادت ہے کہ اصطلاحات علمیہ کو یاد کرکے ہر جگہ انہی کو چلایا کرتے ہیں اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ علوم قرآنیہ کو علوم درسیہ سے مقدم کرنا چاہیے بلکہ پہلے بھی علوم قرآنیہ کو پڑھیں اور خاتمہ بھی انہی پر کریں۔ نہ تو یہ کریں کہ علوم درسیہ کو سب سے پہلے پڑھیں نہ یہ کریں کہ علوم دینیہ سے بالکل فارغ ہو کر پھر علوم درسیہ[۴] میں مشغول ہوں کیونکہ پہلی صورت میں یہ اصطلاحات ذہن میں رچ جائیں

۱۔ اس کے علاوہ سے
۲۔ عبادت کو عالم خلق اور مجردات کو عالم امر کہتے ہیں
۳۔ بعد میں بنائی گئی
۴۔ منطق فلسفہ وغیرہ فنون

گی۔ پھر ہر جگہ قرآن و حدیث میں وہی سوجھیں گی حالانکہ قرآن و حدیث میں یہ اصطلاحات اور علوم درسیہ کام نہیں دیتے۔ اور دوسری صورت میں یہ خرابی ہے کہ جو علم اخیر میں پڑھا جاتا ہے دل پر اسی کا اثر رہ جاتا ہے پس معقول و فلسفہ کو سب سے اخیر میں پڑھنا بھی برا ہے بلکہ ان علوم کو وسط[1] میں رکھنا چاہیئے ورنہ کم از کم دوش[2] بدوش تو ضرور ہوں۔ اصطلاحات کے رچ جانے کا ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں۔

دیوبند میں جب میں پڑھتا تھا تو حضرت استاد (مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) نے مجھے مسئلہ تصور[3] شیخ لکھ کر نقل کے لیے دیا، میں اس کو نقل کر رہا تھا کہ ایک نووارد طالب علم آئے جواب تک معقول ہی میں منہمک رہے تھے مجھ سے پوچھنے لگے کیا لکھ رہے ہو۔ میں نے کہا مسئلہ تصور شیخ وہ بولے کیا شیخ بوعلی سینا۔ بس ان کے نزدیک بوعلی سینا ہی ایک شیخ تھا۔ کیونکہ معقول پڑھنے کی وجہ سے وہی دل میں رچ[4] گیا تھا۔ پس ایسے ہی لوگوں نے جن کے قلوب پر اصطلاحات علمیہ رچی ہوئی ہیں "الا لہ الخلق والامر" (اسی کے لیے ہے خالقیت اور آمریت) سے عالم امر و عالم مجردات کو ثابت کیا ہے مگر یہ بالکل غلط ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ میں عالم مجردات[5] کا منکر ہوں بلکہ میرا مقصود یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں اس کو بیان کرنا غلط ہے باقی ویسے میں اس کا منکر نہیں ہیں

۱۔ درمیان ۲۔ ساتھ ساتھ ۳۔ تصوف کی ایک اصطلاح ہے ۴۔ بس گیا

۵۔ اہل کشف کو یہ بات کشف سے معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے بعض مخلوقات مادہ اور مقدار والی پیدا کی ہیں ان کو مادیات کہتے ہیں تمام اجسام علویہ و سفلیہ (آسمان و زمین وغیرہ) ایسے ہی ہیں۔ اور بعض مخلوقات مادہ و مقدار سے مجرد (خالی) پیدا کی ہیں ان کو مجردات کہتے ہیں اور ارواح انسانیہ اور دیگر لطائف قلب ایسے ہی ہیں۔ غرض مادیات کو عالم خلق اور مجردات کو عالم امر کہتے ہیں ۱۲ تلخیص۔ التکشف ص ۱۴۱۔

یہ بحث چونکہ بہت دقیق ہے جس کو سمجھنے کے لیے بہت سے اصول کا سمجھنا ضروری ہے اس لیے عوام اس میں زیادہ غور و خوض نہ کریں۔ اگر شوق ہو تو کسی عالم سے سمجھ لیں۔ خلیل احمد

اس کو مانتا ہوں کہ عالم مجردات موجود ہے لیکن اس کی دلیل نصوص قرآنیہ میں کہیں نہیں بلکہ مکاشفہ[1] اس کی دلیل ہے یہ کوئی مسئلہ شرعیہ نہیں ہے جس کے لیے نصوص کی ضرورت ہو بلکہ اس کا تعلق مکاشفہ سے ہے جیسے امریکہ کا وجود شرعی مسئلہ نہیں ہے اسی طرح اس کو سمجھنا چاہیئے پس جن لوگوں کے آنکھیں ہیں انہوں نے عالم مجردات کو دیکھا ہے چنانچہ صوفیہ کرام میں بعضے اصحاب کشف ہیں ان کو عالم مجردات منکشف ہوا ہے اور چونکہ ہم ان کو سچا سمجھتے ہیں اس لیے ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں باقی جو چیز مشاہدہ کے متعلق ہو اس کے لیے دلائل بیان کرنا غلطی ہے بس اس کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اگر کسی کے آنکھیں ہوں وہ خود دیکھ لے۔ رہا یہ کہ فلاسفہ نے تو اس پر دلائل قائم کیے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دلائل محض لچر[2] ہیں سب "بناء الفاسد علی الفاسد" (فاسد کی بنا فاسد پر) چنانچہ طلبہ خوب جانتے ہیں مگر وہ مجردات[3] قدیم نہیں ہیں بلکہ حادث[4] ہیں اور حادث بھی بالزمان[5] جس کی دلیل "الا لہ الخلق" (اس کے لیے خالقیت ہے) ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام چیزیں مخلوق ہیں اس میں مثال بھی داخل ہے اگر کوئی اس استدلال پر یہ شبہ کرے کہ اس آیت میں تو خلق مقابل امر کا ہے اس لیے یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ عالم کی دو قسمیں ہیں ایک حادث بالزمان[6] جو عالم خلق ہے ایک غیر حادث بالزمان[7] جس کا نام عالم امر ہے تو یہ احتمال اگرچہ غلط ہے مگر میں اس سے قطع نظر کرکے دوسری دلیل بیان کرتا ہوں حق تعالی فرماتے ہیں "اللہ خالق کل شئی" (اللہ تعالیٰ ہر چیز کے خالق ہیں) دیکھو کل شئے

۱- بذریعہ کشف ۲- بہت کمزور ۳- ہمیشہ سے ہوں ہمیشہ رہیں ایسا نہیں
۴- بلکہ ختم ہونے والے ہیں ۵- زمانہ کے اعتبار سے
۶- زمانے کے اعتبار سے ختم ہونے والا ۷- زمانے کے اعتبار سے ختم نہ ہونے والا

میں مجردات بھی آ گئے اگر کہا جاوے کہ "خلق ایجاد من العدم"[1] کے ساتھ خاص نہیں تو دوسری آیت لیجیے "بدیع السموات والارض"[2] (آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے) "ابداع اخراج من العدم"[3] ہی کے ساتھ خاص اور فلاسفہ عالم مجردات[4] و افلاک[5] دونوں کو غیر حادث بالزمان[6] کہتے ہیں اور فرق کا کوئی قائل نہیں۔ پس ایک کے ابداع سے دوسرے کے ابداع کا بھی قائل ہونا پڑے گا۔ پس فلاسفہ اور صوفیہ کے قول میں اتحاد نہیں۔ فلاسفہ عالم مجردات کو قدیم مانتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک کوئی مجرد حادث نہیں اور صوفیہ مجردات کے قائل ہیں مگر ان کو حادث بالزمان[7] مانتے ہیں البتہ متکلمین تجرد کو اخص[8] صفات باری تعالیٰ قرار دے کر ان کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا تمام چیزیں حادث ہیں اس کے قائل ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا مجرد ہی کوئی نہیں لہذا وہ عالم مجردات کے منکر ہو گئے مگر صوفیہ نے چونکہ عالم مجردات کو دیکھا ہے اس لیے وہ اس کے وجود کے قائل ہو گئے لیکن وہ اس کو حادث[9] مانتے ہیں۔ فلاسفہ کی طرح قدیم[10] نہیں مانتے پس ان کے نزدیک تجرد حق تعالیٰ کے لیے اخص صفات سے نہیں بلکہ وجوب وقدم اس کے اخص صفات سے ہے پس مجرد تو غیر خدا بھی ہو سکتا ہے۔ مگر مجرد قدیم خدا کے سوا کوئی نہیں۔ اور یہاں سے بعض لوگ یہ سمجھ گئے کہ صوفیہ فلسفی ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ صوفیہ فلسفہ کی کچھ بھی وقعت نہیں سمجھتے وہ تو ہمہ تن شریعت کے متبع ہیں البتہ جن امور سے شریعت نے سکوت[11] کیا ہے ان کے متعلق بعض دفعہ وہ اپنے مکاشفات بیان کر دیتے ہیں

۱۔ پیدا کرنا عدم سے وجود میں لانے کے ساتھ خاص نہیں ۲۔ البقرۃ آیت: ۱۱۷
۳۔ ابداع کے معنی ہی عدم سے نکالنے کے ہیں ۴۔ عالم ارواح ۵۔ آسمانوں کو
۶۔ زمانے کے ساتھ ختم ہونے والا نہیں ۷۔ ایجاد ۸۔ زمانے کے اعتبار سے ختم ہونے والا مانتے ہیں ۹۔ خاص اللہ کی صفت قرار دینے والا ۱۰۔ ہمیشہ رہنے والا ۱۱۔ خاموشی

چنانچہ عالم مجردات کا مسئلہ بھی محض کشفی ہے جو اتفاقاً فلاسفہ کے قول سے من وجہ موافق ہوگیا لیکن ہر عاقل جانتا ہے کہ توافق اور چیز ہے اخذ اور چیز[1] ہے۔ صوفیہ نے اس مسئلہ کو فلاسفہ سے نہیں لیا بلکہ خود اپنے کشف سے معلوم کیا ہے جو لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں وہ صوفیہ پر فلسفی ہونے کا گمان کرنے لگے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے قرآن میں بعض باتیں تورات وانجیل کے موافق دیکھ کر یہ گمان کرلیا ہے کہ قرآن تورات وانجیل سے ماخوذ ہے حالانکہ توافق اور چیز ہے اور اخذ اور چیز ہے توافق سے اخذ کیونکر لازم آگیا۔ حضور ﷺ نے تورات وانجیل کو کبھی دیکھا بھی نہیں نہ آپ عبرانی اور نہ سریانی زبان کو جانتے تھے نہ اہل کتاب سے اختلاط[2] کی آپ کو نوبت آئی پھر قرآن تورات وانجیل سے ماخوذ کیونکر ہوگیا۔ علاوہ ازیں بعض واقعات میں اہل کتاب نے تحریف وتبدیل بھی کردی تھی جن کو قرآن میں صحیح طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اگر قرآن ان کتابوں سے ماخوذ ہوتا تو یہ واقعات قرآن میں بھی اسی طرح ہوتے جس طرح انجیل وتورات میں تھے حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام اور داؤد علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کے واقعات قرآن میں ایسے طرز پر مذکور ہیں جن سے ان حضرات انبیاء علیہم السلام کی نزاہت[3] وعصمت ثابت ہوتی ہے اور تورات وانجیل میں لوگوں نے نہ معلوم کیا گڑبڑ کر رکھی ہے ان سے ہرگز ان حضرات کی عصمت ونزاہت ثابت نہیں ہوتی پس جس طرح قرآن مجید کی نسبت یہ خیال غلط ہے اسی طرح صوفیہ پر بھی فلسفی ہونے کا گمان بالکل غلط ہے۔ غرض عالم مجردات کا وجود فی نفسہ صحیح ہے جس کے قائل بعض صوفیہ ہوئے ہیں اور متکلمین اس کے بالکل منکر ہیں مگر کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ اس کا قائل ہونا شرعاً لازم

۱۔ ایک مسئلے کا دوسرے کے موافق ہونا اور ہے اور مسئلہ کا دوسرے مسئلے سے نکالنا اور
۲۔ میل جول ۳۔ پاکیزگی اور پاکدامنی

نہیں جیسے امریکہ کا قائل ہونا ضروری نہیں اور متکلمین کے منکر ہونے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ "الا لہ الخلق والامر" (اسی کے لیے خالقیت اور آمریت ہے) سے عالم امر مراد ہونا ثابت نہیں ورنہ وہ ہرگز انکار نہ کرتے نص قرآنی کے ہوتے ہوئے متکلمین کبھی کسی مسئلہ کا انکار نہیں کرسکتے۔ خیر یہ تو بیچ میں ایک جملہ معترضہ تھا۔

چیزوں کو حلال و حرام قرار دینا اللہ ہی کا کام ہے

میں یہ کہہ رہا تھا کہ "الا لہ الخلق والامر" سے خالقیت و آمریت دونوں کا خدا کے لیے مخصوص ہونا معلوم ہوگیا۔ پس مخلوق کو نہ اختیار تکوینی[۱] حاصل ہے نہ اختیار تشریعی[۲]۔ بلکہ یہ دونوں اختیارات خدا تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں اور اسی کی فرع یہ بھی ہے کہ مباحات[۳] میں بھی تصرف شرعی کا اجرا ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ قاعدہ فقہیہ ہے "الاصل فی الاشیاء الاباحۃ" (اصل اشیاء میں اباحت ہے) جس سے معلوم ہوا کہ قبل شریعت کے بھی اباحت موجود تھی۔ پس اباحت کا وجود شریعت پر موقوف نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ "الاصل فی الاشیاء الاباحۃ" (اشیاء میں اصل اباحت ہے) یہ قاعدہ بھی تو شریعت ہی سے معلوم ہوا۔ تو اباحت اصلیہ[۴] کا ظہور بھی شریعت کے بتلانے پر موقوف ہوا۔ اگر شریعت یہ قاعدہ نہ بتلاتی تو اباحت اصلیہ کا ظہور کبھی نہ ہوتا۔ تو گویا قبل ورود[۵] شرع کے اباحت کا وجود اشیاء میں تھا مگر ظہور نہ تھا۔ شریعت نے اس کو ظاہر کیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ظہور کے بغیر وجود بمنزلہ

۱۔ یعنی تقدیر بدل دے ۲۔ کہ شرعی حکم بدل دے ۳۔ جائز کاموں میں بھی شرعی حکم جاری ہوتا ہے ۴۔ یہ حکم کہ تمام چیزوں میں اصل جواز ہے جب تک اس کے خلاف شرعی حکم نہ آئے شریعت کے ظاہر کرنے سے ہی معلوم ہوا ۵۔ شریعت محمدیہ کے نزول سے پہلے

مقدم[۱] کے ہے پس یہ کہنا صحیح ہے کہ اباحت بھی شریعت ہی پر موقوف ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ اس دوا کو طبیب سے پوچھ کر استعمال کرنا چاہیے نہ معلوم مضر ہے یا نافع[۲] ظاہر ہے کہ نفع یا ضرر جو کچھ بھی ہے دوا میں پہلے سے موجود ہے طبیب اس میں ضرر یا نفع پیدا نہ کرے گا مگر پھر بھی اس کا استعمال طبیب کی رائے پر موقوف ہے کیونکہ وہ مظہر نفع و ضرر[۳] ہے۔ اور یہاں تو خالق و مظہر[۴] دونوں حق تعالیٰ ہی ہیں پہلے خدا تعالیٰ نے اشیاء میں اباحت و حرمت پیدا کی پھر اس کو ظاہر کیا چنانچہ اس ظاہر کرنے ہی کا نام ورود[۵] شرع ہے پس یہ مسئلہ ثابت ہوگیا کہ حلال و حرام کرنا حق تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ چنانچہ ایک جگہ نہایت تصریح کے ساتھ حق تعالیٰ فرماتے ہیں "ولا تقولوا لما تصف السنتكم الكذب هذا حلال و هذا حرام لتفتروا على الله الكذب"[۶]. یعنی کسی چیز کے بارہ میں بدون علم کے یہ نہ کہو کہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کیونکہ اس میں خدا تعالیٰ پر افترا باندھنا[۷] ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کسی چیز کو حرام کرنا خدا کا کام ہے جب ہی تو بلا دلیل حرام کہنا افتراء ہوگا اسی طرح حلال کرنا بھی خدا ہی کا کام ہے پس وہ دعویٰ بخوبی ثابت ہوگیا جس کو میں نے شروع میں بیان کیا تھا کہ مباح کو مباح کرنا بھی ایک تصرف ہے اور دین کا تصرف جس طرح فرائض و واجبات و محرمات میں ہوتا ہے اسی طرح مباحات میں بھی ہوتا ہے اور "لتفتروا على الله الكذب (تاکہ کذب کا اللہ تعالیٰ پر افتراء کرو) سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کو بدون علم کے حرام و حلال کہنا خدا پر افتراء کرنا ہے اس کی

۱۔ لازم ہونے کے ہے ۲۔ فائدہ مند ہے یا نقصان دہ ۳۔ نفع نقصان کو ظاہر کرنے والا ہے
۴۔ پیدا کرنے والے اور ظاہر کرنے والے ۵۔ شریعت میں آنا یعنی شرعی حکم
۶۔ نحل آیت: ۱۱۶ ۷۔ پر جھوٹ کہنا ہے

دو صورتیں ہیں اگر حلال و حرام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عند اللہ حلال یا حرام ہے حالانکہ حکم شرعی ہم کو معلوم نہیں تب تو افتراء ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ یہ چیزیں خود بخود حلال و حرام ہیں بدون خدا کے حلال و حرام کیے تب بھی جھوٹ ہے کیونکہ خود بخود کوئی چیز حلال و حرام نہیں ہو سکتی چنانچہ یہ ایسی بدیہی[1] بات ہے کہ کفار بھی اس خیال کے قائل نہ تھے وہ بھی جن چیزوں کو حلال و حرام کہتے تھے ان کے متعلق یوں کہا کرتے تھے "واللہ امرنا بھا" کہ خدا نے ہم کو اس کا حکم کیا ہے تو اتنی بات وہ بھی جانتے تھے کہ بدون خدا کے حلت و حرمت کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔

از خود چیزوں کو حلال و حرام کہنا کھلی بے حیائی ہے

مگر افسوس! آج کل بعض مسلمان اس خیال کے ہو گئے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو دنیوی کاموں سے کیا تعلق ان میں ہم خود مختار ہیں جو چاہیں کریں گویا وہ امور[2] دنیویہ کو خود بخود حلال سمجھتے ہیں اس عقیدہ میں یہ لوگ کفار سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے۔ جیسے بعض کفار کی یہ حالت قرآن میں بیان کی گئی ہے کہ دریا میں سوار ہو کر جب طوفان میں مبتلا ہوتے ہیں تو خدا ہی کو پکارتے ہیں خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں پکارتے اپنے سب معبودوں کو اس وقت بھول جاتے ہیں مگر ہم نے بعض مسلمانوں کو جہاز میں دیکھا ہے کہ وہ طوفان کے وقت یا غوث اعظم یا علی وغیرہ کہتے ہیں ان ظالموں کا شرک اس وقت بھی دور نہ ہوا جبکہ مشرکین کا شرک زائل ہو جاتا ہے تو یہ ان سے بھی بڑھ گئے۔ اسی طرح جو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ بعض چیزیں خود بخود حرام و حلال ہیں یا اپنی طرف سے ان کو حلال و حرام کہتے ہیں تو یہ خدا پر افتراء و کذب کرتے ہیں کیونکہ قاعدہ ہے "الشئ اذا ثبت ثبت

۱- واضح ۲- دنیوی کاموں

بلوازمہ" (کوئی چیز جب ثابت ہوتی ہے تو اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے) اور کسی چیز کے حلال و حرام ہونے کے لیے لازم ہے کہ خدا تعالیٰ اس کو حلال و حرام کریں اس لیے کہ حلت و حرمت[۱] حق تعالیٰ کا حق ہے تو جب اس نے خود کسی چیز کو بدون حکم خداوندی کے حلال و حرام کہا تو یہ شخص اس حق کو اپنے واسطے ثابت کرنا چاہتا ہے اور یہ بہت بڑا افتراء ہے کہ اپنے کو خدا کا شریک بنا رہا ہے اس میں جھوٹ کے ساتھ بے حیائی اور بے شرمی بھی ہے جیسے ایک شخص کسی نواب یا رئیس کا مال چرا لاوے اور یہ کہے کہ فلاں نواب صاحب نے یہ مجھ کو عطا کیا ہے اس نے جھوٹ تو بولا مگر نمک حرامی نہیں کی اس چیز کو نواب صاحب ہی کی طرف منسوب کیا کہ یہ ان کی ہے مگر انہوں نے مجھے دے دی، اور ایک شخص چرا کر یہ کہے کہ یہ چیز میری ہے۔ یہ چور بھی ہے اور نمک حرام بھی پس آجکل جو مسلمان خود بخود بعض چیزوں کو حلال و حرام کرتے رہتے ہیں وہ دوسری صورت میں داخل ہیں جس سے پہلے زمانہ کے کافر بھی بچتے تھے وہ کسی چیز کو از خود حلال و حرام نہ کہتے تھے بلکہ تحلیل و تحریم کا حق خدا ہی کے لیے مانتے تھے، ہاں ایک دعویٰ جھوٹا کیا کرتے تھے کہ "اللہ امرنا بہا" (خدا نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے) جس کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا "قل ان اللہ لا یامر بالفحشاء" [۲]. کہ خدا تعالیٰ فحش و بے حیائی کا امر نہیں کیا کرتا اور جو کام تم کرتے ہو یہ فحش اور بے حیائی کے کام ہیں یہ ہرگز خدا کی طرف سے مامور و ماذون[۳] بہا نہیں ہوسکتے غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ تحلیل و تحریم خدا کا کام ہے بدون خدا کے بتلائے ہم کسی مباح کو مباح بھی نہیں کہہ سکتے خواہ وہ عبادات میں سے ہو یا عادات میں سے۔ پس لوگوں کا یہ کہنا کہ آجکل مولویوں کا داڑھی رکھنے کو فرض کہنا تجارات و معاملات میں دخل دینا

۱- حلال و حرام قرار دینا ۲- الاعراف آیت: ۲۸ ۳- حکم دیئے ہوئے اور اجازت شدہ

کہ یہ ناجائز اور حرام ہے یہ جائز اور مباح ہے صحیح نہیں بالکل غلط ہے کیونکہ دین کا تعلق محض عبادات ہی سے نہیں ہے بلکہ وہ عادات میں بھی تصرف کرتا ہے اور "انتم اعلم بامور دنیاکم" (تم اپنی دنیا کے کاموں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو) سے استدلال کا جواب ہوچکا ہے کہ علم اور تخبیر[1] میں فرق ہے اور تفسیر حدیث کی آگے آتی ہے۔

مباحات میں بھی حکم رسول کے بعد اختیار ختم

سو اس حدیث میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ امور دنیا میں تم خود مختار ہو۔ بلکہ اس کے خلاف دلائل صحیحہ سے ثابت ہے کہ امور دنیا میں بھی ہم لوگ خود مختار نہیں ہیں بلکہ حکم شرعی کے پابند ہیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ کا پیغام نکاح زینب بنت جحشؓ سے بھیجا۔ چونکہ حضرت زید لوگوں کی زبانوں پر غلام مشہور تھے واقع میں وہ غلام نہ تھے بلکہ شریف الاصل آزاد تھے لیکن بدووں نے ان کو کسی قافلہ سے پکڑ کر زبردستی غلام بنالیا اور بیع[2] کردیا تھا اس لیے وہ غلام کے لقب کے ساتھ بدنام ہوگئے جیسے بعض قصبات میں بعض شریف قوموں کے کچھ القاب مشہور ہوجاتے ہیں پھر لوگ ان کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح حضرت زید بھی بدنام ہوگئے تھے اس لیے حضرت زینب نے اور ان کے بھائی نے اس پیغام کی منظوری میں تامل کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی "وماکان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی الله ورسوله امرا ان یکون لهم الخیرة من امرهم"[3]. اور کسی مسلمان مرد یا عورت کو یہ اختیار نہیں کہ جب خدا اور رسول اللہ ﷺ کسی بات کا فیصلہ فرماچکیں تو پھر ان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار رہے۔ صاحبو! ظاہر ہے کہ پیغام نکاح کا منظور کرنا یا نہ کرنا عبادات میں سے نہیں ہے

۱۔ اختیار دیتے ہیں　　۲۔ بیچ دیا　　۳۔ الاحزاب آیت:۳۶

بلکہ یہ ضروریات زندگی میں سے ایک امر[1] ہے جیسے کھانا پینا۔ پھر اس میں عورت اور اس کے اولیاء کی رضامندی بھی شرعاً وعرفاً ضروری ہے چنانچہ کفاءت[2] کا اعتبار خود شریعت نے کیا ہے لیکن با ایں ہمہ[3] اس واقعہ میں عتاب نازل ہوا کہ حضور ﷺ کی قطعی مرضی معلوم ہوجانے کے بعد مسلمانوں کو کچھ اختیار نہیں کہ وہ دنیوی امور میں بھی حضور ﷺ کی رائے کی مخالفت کریں اگر دنیوی امور میں تخییر[4] ہے تو یہ عتاب کیوں ہوا۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب شریعت نے کفاءت کا لحاظ خود ضروری سمجھا ہے تو حضرت زینب اور ان کے بھائی پر اس کے لحاظ سے عتاب کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ حضرت زیدؓ واقع میں کفو[5] تھے لیکن انہوں نے محض ظاہری شہرت کی بناء پر ان کو کفو نہیں سمجھا نیز یہ بھی نہ شبہ کیا جائے کہ حضرت بریرہؓ کے واقعہ میں تو حضور ﷺ نے ان پر کچھ عتاب نہیں کیا حالانکہ انہوں نے مشورہ نبوی ﷺ کی مخالفت کی تھی۔ یہاں حضور ﷺ کے مشورہ کے خلاف کرنے پر حضرت زینب اور ان کے بھائی پر کیوں عتاب ہوا۔ بات یہ ہے کہ واقعہ بریرہؓ میں حضور ﷺ نے کچھ فیصلہ نہیں فرمایا تھا محض مشورہ کا درجہ[6] تھا۔ اور یہاں حضور ﷺ اپنے دل میں یہ بات طے فرما چکے تھے کہ زید کا نکاح زینب سے ہوجائے اور ان صحابیوں کو بھی قرآن سے اس کا علم ہوگیا تھا لہذا بعد معاملہ طے فرمادینے کے ان کو مخالفت کا حق نہ تھا اور اس کی دلیل خود قرآن کے الفاظ میں موجود ہے "اذا قضی اللہ ورسولہ امرا"۔ (جب اللہ

۱۔ کام ۲۔ حسب نسب وغیرہ میں برابری ۳۔ اس سب کے باوجود

۴۔ اختیار ۵۔ ہمسر تھے ۶۔ چنانچہ اس واقعہ میں حضرت بریرہؓ کا سوال بھی موجود ہے کہ یا رسول اللہ یہ مشورہ ہے یا حکم آپ ﷺ نے جواب دیا تھا کہ مشورہ ہے اس پر حضرت بریرہؓ نے کہا تھا کہ میں نہیں مانتی معلوم ہوا کہ اگر حکم ہوتا مجال انکار نہ تھا لیکن مشورہ میں مستشیر کو اجازت ہے چاہے عمل کرے چاہے عمل نہ کرے

اور اس کا رسول ﷺ کسی بات کا فیصلہ کر دیں) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ اپنی طرف سے اس معاملہ کو طے فرما چکے تھے۔ بہر حال اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ دنیوی امور میں بھی شریعت کا تصرف جاری ہے اور مسلمانوں کو اس کی مخالفت کا حق نہیں۔

چند کتابیں پڑھنے سے آدمی محقق نہیں ہو جاتا

اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ نا تمام علم کافی نہیں۔ محض دو چار کتابیں پڑھنے سے انسان عالم نہیں ہو جاتا۔ آپ نے اس ناقص علم کی حالت دیکھ بھی لی کہ یہ لوگ "انتم اعلم باموردنیاکم" (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو) سے دنیوی امور میں تخییر کے قائل ہو گئے یہ نہ دیکھا کہ دوسری نصوص[1] سے اس کی نفی ہو رہی ہے اس لیے یہ مطلب صحیح نہیں۔ آجکل ہر شخص اپنے کو عالم اور مجتہد سمجھتا ہے مگر جب محقق کے سامنے وہ جاتے ہیں اس وقت ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ ہمارا علم سراسر جہل تھا اس لیے اپنے علم کو کسی محقق کے سامنے پیش کرو اگر وہ تصدیق کر دے تب اس کو صحیح سمجھو ورنہ وہ محض جہل ہے صاحب کہتے ہیں۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(اپنے جوہر کسی صاحب نظر کو دکھلاؤ چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں بن سکتا)

چند احمقوں کے مولانا کہنے سے کوئی عالم اور مولانا نہیں ہو جاتا اس کے لیے کسی صاحب نظر کے پاس رہنے کی اور تصدیق کی ضرورت ہے صاحب نظر کون لوگ ہیں یہ وہ کاملین ہیں جو شریعت و طریقت کے جامع ہیں ان کے پاس رہ کر دین

۱۔ آیات واحادیث

سے ایک خاص ذوق حاصل ہوتا ہے۔ یہ ذوق محض کتابوں کے ترجمہ سے نہیں حاصل ہوتا بلکہ اس کا طریقہ صحبت کاملین ہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

قال را بگذار و مرد حال شو　　　　پیش مردے کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو یہ اس وقت ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑجاؤ)

صاحبو! علماء کے اندر بھی سب محقق نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے کوئی محقق ہوتا ہے ورنہ اکثر محض کتابی عالم ہوتے ہیں جن کو عبارتوں کا ترجمہ کرنا آتا ہے اور اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ میزان[۱] پڑھنے والے کو بھی مولوی سمجھتے ہیں اور جو درسیات سے فارغ ہوجائے وہ تو گویا رجسٹری شدہ مولوی ہے حالانکہ علم صرف اسی کا نام نہیں بلکہ اس کے بعد ایک علم اور ہے اس کے بعد آدمی محقق ہوتا ہے علم اور دین کا ذوق اسی کو عطا ہوتا ہے عارف فرماتے ہیں۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　　　نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتہ باریکتر ز مو اینجاست　　　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

(دلبری ہر وہ شخص نہیں جانتا جو چہرہ کو چمکالے نہ ہر وہ شخص سکندری جانتا ہے جو اپنے پاس آئینہ رکھتا ہو یہاں بال سے بھی زیادہ باریک ہزاروں نکتے ہیں قلندری ہر وہ شخص نہیں جانتا جو اپنا سر منڈا لے)۔

تعجب ہے کہ ہر فن میں تجربہ کی ضرورت مسلم ہے ہر علم میں نو تعلیم یافتہ اور تجربہ کار میں فرق کیا جاتا ہے مثلاً نجار[۲] اور معمار[۳] اور طبیب وغیرہ جتنے پرانے تجربہ کار ہوں اسی قدر ان کی قدر زیادہ ہوتی ہے اور نو تعلیم یافتہ کو ان کی برابر ہرگز نہیں سمجھا جاتا حالانکہ کتابیں جتنی نئے طبیب نے پڑھی ہیں اتنی ہی پرانے طبیب

۱۔ کتاب کا نام　　۲۔ بڑھئی　　۳۔ عمارت بنانے والا مستری

نے پڑھی ہیں اور جو مسائل بخاری کے نئے تجار نے سیکھے ہیں وہی پرانے نے سیکھے ہیں مگر اس میں ایک بات زیادہ ہے یعنی تجربہ اس لیے اس کی قدر و منزلت زیادہ ہے مگر علم دین میں جو لوگ تجربہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتے ہیں۔ تو کیا ان کے نزدیک علم خسیسہ[1] کے مسائل تو باریک باریک ہیں اور شریعت ہی کے مسئلے موٹے موٹے ہیں افسوس ان لوگوں کو شریعت کی حقیقت معلوم نہیں دیکھئے طب کی کتابوں میں ہر مرض کی دوا لکھی ہوئی ہے جن کو دیکھ کر ہر شخص بتلا سکتا ہے کہ اس مرض کی یہ دوا ہے مگر طبیب کی ضرورت پھر بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ تشخیص کون کرے گا کہ اس شخص کو فلاں مرض ہے فلاں مرض نہیں اسی کی تشخیص کے لیے اطباء کی خوشامد کی جاتی ہے ورنہ علاج کر دینا کیا مشکل ہے اسی طرح شریعت میں بھی تمام امراض روحانیہ کا علاج موجود ہے مگر طبیب روحانی کی ضرورت اس لیے ہے تاکہ یہ تشخیص ہو کہ آپ کے اندر مرض کیا ہے نیز جس طرح اطباء کو پہلے زمانہ کے نسخوں میں اجتہاد کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ آجکل کے مزاجوں کے موافق نہیں ہیں اسی طرح اطباء روحانی کو بھی اس کی ضرورت پیش آتی ہے تو یہ کام ہر عالم تو نہیں کر سکتا یہ تو بڑا ہی تجربہ کار کر سکتا ہے۔ اگر ناتجربہ کار یہ کام کرنے لگے تو وہ ضرور مخلوق کو تباہ کرے گا۔

ایک جاہل طبیب کی حکایت

چنانچہ ہماری طرف ایک طبیب ہیں جو باقاعدہ طب پڑھے ہوئے نہیں ہیں نہ کسی کے پاس رہ کر مطب کیا ہے لیکن وہ علاج کرتے ہیں اور علاج کا طریقہ یہ ہے کہ مریض سے کہہ دیتے ہیں کہ پہلے کسی ہوشیار طبیب سے مرض کی تشخیص کرا لاؤ علاج میں کر دوں گا۔ جب مریض کسی حکیم سے تشخیص کرا لاتا ہے تو وہ کتاب دیکھ

۱۔ گھٹیا علوم

کر علاج کر دیتے ہیں اگر کہیں مریض کو نقصان ہوا تو وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں کہ صاحب فلاں حکیم نے تشخیص میں غلطی کی ہوگی باقی میں نے تو اسی مرض کا علاج باقاعدہ کیا ہے جو انہوں نے تشخیص کیا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی جواب ہے جو شخص مرض کی تشخیص نہیں کر سکتا وہ علاج کیسے کر سکتا ہے دوسرے کی تشخیص سے آپ کو مزاج کا درجہ اور تغیر اخلاط[۱] کی کیفیت کیسے معلوم ہو جائے گی اور جب یہ معلوم نہیں تو آپ نسخہ میں اس کی رعایت کیسے کریں گے جب اس کی رعایت نہ ہوگی تو مریض کو نفع کیسے ہوگا مگر آجکل ہر شخص مجتہد بنا ہوا ہے جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں ذرا وہ صاحب مجھ سے ملیں تو ان کی خبر لوں گا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور محبت تو بلا ہے جو اس کا دعویٰ کرے گا اس کے ساتھ تو ایسا ہی برتاؤ کیا جائے گا ہاں کوئی محبت کا دعویٰ نہ کرے تو میں اس سے خاص خطاب نہیں کرتا عام خطاب میں سب کچھ کہہ دیتا ہوں۔ غرض آجکل ہر شخص مفسر و مترجم ہے اور ہر ایک شریعت میں رائے دیتا ہے۔ گویا شریعت کا سمجھنا تمام فنون سے آسان ہے حالانکہ یہ تو قانون الٰہی ہے جب دنیوی سلاطین کے قوانین کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ خاص وکلاء اور بیرسٹر اور ہائی کورٹ کے جج ہی اس کو سمجھتے ہیں تو خدائی قانون کو ایسا کیا آسان سمجھ لیا ہے۔

بہاولپور میں ایک شخص نے قرآن کا ترجمہ یاد کر رکھا تھا اور اس کو بڑا ناز تھا کہ میں ترجمہ قرآن کو خوب جانتا ہوں ایک مرتبہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے اس سے پوچھا کہ بتلاؤ "مدھامتن" کا کیا ترجمہ ہے۔ کہنے لگے بہت سیاہ، مولانا نے پوچھا بہت کا ہے کے معنیٰ اور سیاہ کا ہے کے معنیٰ تو آپ فرماتے ہیں مدھام کے معنیٰ بہت اور متان کے معنیٰ سیاہ[۲] بس کتابیں پڑھنا اور ہے اور علم سے

۱۔ انسان جن چار خلطوں سے مل کر بنا ہے ان میں کیا تغیر ہوا   ۲۔ کالا

مناسبت اور ہے۔

حدیث کی تشریح

چنانچہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو) کے معنی میں بھی غلطی اسی وجہ سے کی گئی کہ محض ترجمہ حدیث کا یاد کر رکھا ہے فن سے مناسبت اور دین کا ذوق نہیں پیدا ہوا۔ خزانچی کو خزانہ کا حال بادشاہ سے زیادہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ سلاطین خزانہ کا حساب و کتاب خود نہیں کیا کرتے پس اگر باشادہ خزانچی سے کسی وقت یہ کہدے کہ بھائی خزانہ کا حال تم کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تم اس میں خود مختار بھی ہو کہ جس کو چاہو بانٹ دو، ہرگز نہیں۔ زیادہ جاننے سے خود مختار ہونا کیسے لازم آیا پس جس طرح خزانچی کو خزانہ کا حال بادشاہ سے زیادہ معلوم ہے مگر اسے خرچ کرنے کا اختیار نہیں وہ بدون[1] اجازت شاہی کے کسی کو ایک حبہ[2] بھی نہیں دے سکتا اسی طرح دنیا کے کاموں کو ہم انبیاء سے زیادہ جانتے ہیں کہ زراعت کیونکر ہوا کرتی ہے باغبانی کس طرح کیا کرتے ہیں، کپڑے کیسے بنا کرتے ہیں مگر ہم ان کاموں میں خود مختار نہیں ہیں کہ جس طرح چاہیں کریں بلکہ جس کام کو انبیاء علیہم السلام جائز کریں گے ہم اس کو کر سکتے ہیں اور جس سے منع کردیں اس کو چھوڑ دینا واجب ہے۔ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ اس حدیث میں تو لفظ اعلم مطلق ہے جس کے یہ معنیٰ بھی ہوسکتے ہیں "انتم اعلم باحکام امور دنیاکم" (تم دنیاوی کاموں کے احکام کو زیادہ جانتے ہو) اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں "انتم اعلم بتدابیر امور دنیاکم" (تم دنیوی کاموں کے طریقے خوب جانتے ہو) پس تم نے دوسرے معنی کو کس دلیل سے ترجیح دی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے دوسرے معنی کو اس لیے ترجیح

۱- بغیر ۲- دانہ

دی ہے کہ دوسری احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ ہم لوگ دنیوی کاموں کے احکام کو حضور ﷺ سے زیادہ نہیں جانتے۔

چنانچہ حضرت زینبؓ کے نکاح کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت احادیث اس قسم کی ملیں گی۔ دوسرے خود اس حدیث کے واقعہ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو مطلب میں نے بیان کیا ہے وہی صحیح ہے۔ آپ نے فقط انہی الفاظ کو دیکھا ہے اس لیے اشکال پیدا ہوا اگر پوری حدیث کو دیکھتے تو شبہ نہ ہوتا۔ اور اکثر آیات واحادیث میں جہاں کسی کو اشکال ہوتا ہے اس کا سبب زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ اس کے سیاق و سباق[1] میں غور نہیں کیا گیا اس لیے طلبہ کو چاہیئے کہ ہر آیت کو منفرداً[2] نہ دیکھا کریں بلکہ اس کے ساتھ اس کے سیاق و سباق میں بھی غور کیا کریں ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی اشکال نہ ہوگا۔

ایک اشکال کا جواب

چنانچہ اس وقت مجھ کو ایک آیت یاد آئی اس میں اکثر طلبہ کو اشکال ہوا کرتا ہے لیکن اس کا منشاء بھی سباق میں نظر نہ کرنا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں "ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً"۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے۔ اور حق تعالیٰ کافروں کو ہرگز مسلمانوں پر راہ نہ دے گا یعنی غالب نہ کرے گا۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہوجاتا ہے مگر ان صاحبوں نے اس سے پہلے جملے کو نہیں دیکھا، پوری آیت اس طرح ہے۔ "فاللہ یحکم بینھم یوم القیمۃ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً"[3]۔ پس خدا مسلمانوں میں اور کافروں میں قیامت کے دن فیصلہ فرماویں گے اور خدا تعالیٰ کافروں کو ہرگز مسلمانوں پر راہ نہ دے گا قیامت

۱۔ اول و آخر ۲۔ اکیلے ۳۔ النساء آیت: ۱۴۱

کے فیصلہ میں ہر گز ان کو غلبہ نہ ہوگا کیونکہ وہ ظہور حقائق کا وقت ہے اس وقت حق و باطل میں پورا امتیاز ہو جائے گا، اس لیے وہاں حق ہی کو غلبہ ہوگا۔ باطل کو ہر گز غلبہ نہ ہوگا اور دنیا دار العمل[1] ہے یہاں بطور امتحان کے کبھی باطل کو حق پر غلبہ ظاہر میں ہو سکتا ہے تو یہاں دنیوی سلطنت و حکومت سے کیا بحث جو یہ اشکال وارد ہو۔ دنیا میں کفر کے غلبہ کی نفی اس آیت سے کہاں مفہوم[2] ہوتی ہے۔ پس قرآن و حدیث کو جب دیکھو پورے مضمون کو دیکھو ادھورا مضمون مت دیکھو، اشکال اسی سے وارد[3] ہوتا ہے۔ پس سب سے پہلے اس حدیث کا واقعہ دیکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اہل مدینہ کو آپ نے دیکھا کہ وہ کھجوروں کی تابیر کرتے ہیں۔ تابیر اسے کہتے ہیں کہ نر کھجور کے پھولوں کو مادہ سے چھوادیا جائے۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ہے کہ کھجور میں ایک نر ہوتا ہے ایک مادہ نر کے اوپر صرف پھول آتے ہیں پھل نہیں آتا، مادہ پر پھل بھی آتا ہے تو نر کے پھولوں کو مادہ کے اوپر سے چھوا کر گرادیا جاتا ہے اس سے مادہ پر بہت پھل آتا ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو پھل کم آتا ہے، عجیب خدا کی قدرت ہے جب ایک مس[4] گل میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے مادہ بار آور[5] ہو جاتی ہے تو اگر نفخ جبریل[6] سے حضرت مریم علیہا السلام کو حمل رہ گیا تو کیا تعجب کی بات ہے ملحدوں کی عقل میں یہ بات نہیں آتی اس لیے وہ اس واقعہ کے منکر ہیں اور انہوں نے یوسف نجار کو حضرت مریم علیہا السلام کا شوہر نکالا خیر ملحدوں پر تو تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرت خداوندی کے قائل[7] نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمانان مدعی[8] مفسریت نے بھی جن کو مفسر کہنا ہر گز جائز نہیں اس

۱۔ عمل کرنے کی جگہ ۲۔ سمجھی جا سکتی ہے ۳۔ پیش آتا ہے ۴۔ پھول کے چھونے میں ۵۔ مادہ پر پھل آجاتا ہے ۶۔ جبریل کے پھونک مارنے سے ۷۔ ماننے والے ۸۔ بعض مسلمانوں نے بھی جن کو مفسر قرآن ہونے کا دعویٰ ہے

واقعہ نفخ جبریل کا انکار کیا ہے اور یوسف نجار کو حضرت مریم کا شوہر مانا ہے جو نصوص[۱] قرآنیہ کے صریح[۲] خلاف ہے۔ ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جبریل علیہ السلام کی پھونک سے حمل کیونکر رہ گیا، ان لوگوں کو تابیر سے سبق لینا چاہیے کہ نر کے پھول چھوانے سے مادہ کھجور کیونکر بار آور ہوجاتی ہے۔

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تابیر سے نرم عنوان سے منع فرمایا کہ اگر تم یہ کام نہ کرو تو بہتر ہے۔ غالباً آپ کو ٹوٹکہ اور شگون کا احتمال ہوا کہ کہیں یہ عمل بطور شگون کے نہ کیا جاتا ہو۔ آپ کو یہ نہ معلوم تھا کہ اس میں یہ خاصیت فطرۃً رکھی ہوئی ہے اور کھجور پر زیادہ پھل آنے کا یہی طریقہ ہے۔ شاید کوئی یہاں یہ شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی بات معلوم نہ تھی میں کہتا ہوں کہ ہاں ہم فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تابیر کی خاصیت معلوم نہ تھی کیونکہ آپ سائنس داں نہ تھے کہ جڑی بوٹیوں کی خاصیتیں اور باغبانی کا فن بھی جانتے آپ محض رسول و نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے آپ کے لیے یہی فخر ہے کہ آپ احکام الٰہی اور طرق وصول[۳] الی اللہ کے جاننے والے تھے اور دنیا کی صنعتوں کو نہ جانتے تھے۔

علم دین اور سائنسی علوم میں فرق

سائنس کی حقیقت علوم شرعیہ کے سامنے ایسی ہے جیسے پاخانہ کمانے کا فن کسی فن شریف کے سامنے ہے اب اگر ایک شخص کسی نواب کی تعریف میں یہ کہے کہ فلاں رئیس پاخانہ کمانے کے فن سے بھی ماہر ہیں اور دوسرا یہ کہے کہ وہ اس کام کو جانتے بھی نہیں ان کو اس سے مس[۴] بھی نہیں تو بتلائیے ان دونوں میں ادب والا کون ہے پس جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یہ کہتے ہیں کہ آپ بڑے

۱۔ قرآن حکیم ۲۔ بالکل ۳۔ اللہ تک رسائی کے راستے جاننے والے
۴۔ کوئی تعلق ہی نہیں

سائنس داں تھے وہ ایسے ہی گستاخ ہیں جیسے وہ شخص۔ سائنس کو آپ سے ایسی ہی نسبت ہے جیسے اس فن کو کسی نواب سے پس حقیقت میں آپ کا ادب اور آپ کی تعظیم اسی میں ہے کہ ہم صاف صاف کہدیں کہ ہمارے رسول اللہ ﷺ محض رسول و نبی ﷺ تھے سائنس داں نہ تھے انبیاء، تو ان کاموں سے منع کرتے ہیں کہ بلا ضرورت حقائق و خواص اشیاء عالم کے دریافت[1] کرنے میں مشغول ہوں بلکہ اپنی آخرت کی اصلاح میں مشغول ہونا چاہیئے۔

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

(عشق و محبت الٰہی کی باتیں کرو زمانہ کے اسرار کی جستجو ترک کرو کہ کسی نے بھی اس معمہ کو حکمت سے حل نہیں کیا نہ آئندہ کر سکے گا)۔

راز دہر سے مراد زمانہ کے واقعات اور فنون طبیعہ ہیں جن میں خواص اشیاء و حقائق اجزاء عالم سے بحث کی جاتی ہے۔ فلاسفہ یونان خود اقرار کرتے ہیں کہ علوم طبیعہ تمام علوم میں ادنیٰ[2] ہیں اور اشرف العلوم[3] علم الٰہی ہے پس انبیاء علیہم السلام اشرف العلوم میں مشغول ہوتے ہیں ادنیٰ علم کے پیچھے نہیں پڑتے جس کو اصلاح آخرت میں کچھ بھی دخل نہیں غور کیجیے ایک شخص محبوب سے ملنے گیا اس کے محبوب نے اپنی ملاقات کے لیے ایک خاص میعاد[4] مقرر کر رکھی ہے کہ جو شخص اسی میعاد میں میرے پاس آئے گا میں اس سے ملوں گا اور جو میعاد کے بعد آئے گا اس سے نہ ملوں گا۔ راستہ میں محبوب کا شہر اور قلعہ پڑا اس نے نہ شہر کے بازاروں کی سیر کی نہ قلعہ کے محلات کی سیدھا محبوب کے پاس چلا گیا اور دوسرا شخص بھی

۱۔ دنیا جہاں کی چیزوں کی حقیقت اور خاصیتوں کو معلوم کرنے میں آدمی لگ جائے
۲۔ کم درجہ ۳۔ علوم میں سب سے بہتر ۴۔ وقت معین کر رکھا ہے

اس کی ملاقات کو گھر سے نکلا لیکن جب محبوب کے شہر میں پہنچا تو بازاروں کے بھاؤ تاؤ معلوم کرنے اور قلعہ کے پتھروں کی قیمت معلوم کرنے لگا کہ یہ کہاں سے آئے ہیں، کیونکر آئے ہیں کس نے تراشے ہیں پورے مکان کی کیا لاگت ہے یہاں تک کہ اسی حساب و کتاب میں ملاقات محبوب کی میعاد نکل گئی جب وقت گذر گیا تو آپ محبوب کے سامنے پہنچے اس نے فوراً کان پکڑوا کر دربار سے باہر نکال دیا بتلایئے ان دونوں میں آپ کے عاقل کہیں گے یقیناً اسی شخص کو عاقل کہیں گے جس نے کسی چیز کی طرف لقاء محبوب[1] سے پہلے توجہ نہیں کی۔

اے صاحبو! اسی طرح حق تعالیٰ نے آپ کے لیے ایک میعاد مقرر کی ہے یعنی یہ عمر عزیز پس جو شخص موت کے وقت تک حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرلے اس سے تو وہ ملتے ہیں اور جو ساری عمر خرافات میں گذار دے اس سے وہ کبھی نہ ملیں گے پس جو عاشق ہوگا وہ خرافات میں ہرگز نہ پڑے گا اسی لیے انبیاء علیہم السلام کبھی حقائق اشیاء عالم کے درپے[2] نہیں ہوئے نہ انہوں نے اپنی امت کو اس کی تعلیم دی ہے بلکہ اس میں انہماک سے منع فرمایا ہے پس حضور ﷺ کا طریقہ تابیر کو نہ جاننا کوئی نقص نہیں ہے غرض آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تم یہ نہ کرو تو اچھا ہے۔ صحابہؓ تو حضور ﷺ کے عاشق تھے فوراً چھوڑ دیا۔ صحابہؓ ایسے جاں نثار تھے کہ جب حضور ﷺ کی مرضی کسی امر[3] کے متعلق ان کو معلوم ہوجاتی فوراً اس کی تعمیل کرتے تھے نفع و نقصان کی ذرا پروا نہ کرتے تھے۔

محبت کی انتہاء

چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک صحابی کے مکان کی طرف گذرے

۱۔ محبوب کی ملاقات سے پہلے ۲۔ جہاں کی چیزوں کی حقیقت بیان کرنے کے پیچھے نہیں پڑے
۳۔ کام

حدیث میں آتا ہے فرأى قبة مشرفة کہ حضور ﷺ نے وہاں کوئی قبہ بلند دیکھا، دریافت فرمایا کہ یہ مکان کس کا ہے صحابہؓ نے بتلادیا کہ فلاں صحابی کا ہے۔ بس اتنی بات ہوئی تھوڑی دیر میں وہ صحابی حاضر خدمت ہوئے تو حضور ﷺ نے منہ پھیر لیا، انہیں یہ کہاں گوارا تھا کہ حضور ﷺ کا رخ[1] پھرا ہوا دیکھیں بس بے تاب ہوگئے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

از فراق تلخ مے گوئی سخن
ہرچہ خواہی کن ولیکن ایں مکن
(فراق کی باتیں کرتے ہو اور جو چاہو سو کرو مگر یہ نہ کرو)

صحابہ سے دریافت کیا کہ آج حضور ﷺ کا رخ مجھ سے پھرا ہوا کیوں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم کو اور تو کچھ معلوم نہیں البتہ آج حضور ﷺ تمہارے مکان کی طرف گذرے تھے بلند قبہ دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ کس کا گھر ہے۔ بس اگر حضور ﷺ کو وہ بلند قبہ ناگوار ہوا ہو تو ممکن ہے باقی اور کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی وہ بھی ایسے عاشق تھے کہ یہ بھی تحقیق نہ کیا کہ یہ سبب واقعی ہے یا محض[2] احتمال ہی احتمال ہے اس وہم پر کہ اس قبہ ہی سے شاید آپ کو ناگواری ہوئی ہو فوراً جا کر اسے ڈھا دیا۔

ہرچہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں
ہرچہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا
(یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو)

اس کے چند روز بعد پھر آپ کا گذر اس مکان کی طرف ہوا تو آپ ﷺ نے وہ قبہ[3] نہ دیکھا دریافت فرمایا کہ یہاں ایک بلند قبہ تھا اب کیا ہوا صحابہؓ نے

۱۔ چہرہ نور　۲۔ صرف　۳۔ گنبد نما

عرض کیا کہ اس کے مالک کو آپ ﷺ کی ناگواری کا احتمال ہوا اس لیے ڈھادیا، سبحان اللہ خلوص اس کا نام ہے کہ مکان کو ڈھا کر حضور ﷺ کو اطلاع بھی نہیں کی کہ میں نے آپ کی رضا کے لیے یہ کام کیا ہے آجکل لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر شیخ ان کو کسی ایسی بات کا حکم کرے جس میں بظاہر ان کا دنیوی ضرر ہوتا ہو گو آخرت کا نفع ہی نفع ہو تو اول تو دنیوی ضرر کو گوارا کرنے والے ہی کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ دس مرتبہ شیخ کو آکر سناتے ہیں کہ ہم نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کردی جس میں درپردہ شیخ پر احسان رکھنا ہوتا ہے۔ غرض صحابہ نے تابیر کو اس سال چھوڑ دیا تو اس مرتبہ پھل کم آئے۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ اس سال پھل کم کیوں آئے معلوم ہوا کہ تابیر نہ کرنے سے ایسا ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تابیر کرلیا کرو۔ اس وقت آپ نے یہ بھی فرمایا "انتم اعلم باموردنیاکم" (تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو) اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ دنیوی کاموں کا طریقہ اور سباب کے خواص تم زیادہ جانتے ہو یعنی مجھے اس خاصیت کی اطلاع نہ تھی۔ اور یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ دنیوی کاموں کے احکام میں تم خود مختار ہو۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو آپ پہلے ہی سے منع کیوں فرماتے آپ نے ممانعت اس لیے کی ٹوٹکہ اور شگون کا آپ کو شبہ ہوا تھا جب یہ احتمال رفع ہو گیا اور معلوم ہوا کہ تابیر میں یہ خاصیت فطری ہے اس وقت آپ نے اجازت دیدی۔ باقی اس ارشاد کی حکمت کیا ہے سو میرے دل میں یہ بات القاء[۲] ہوئی ہے کہ اس خاصیت کے معلوم نہ ہونے سے شاید کسی کو نبوت میں شبہ ہوجاتا کہ آپ کو اتنی بھی خبر نہیں اس لیے حضور ﷺ نے یہ بتلادیا کہ یہ نہ جاننا کوئی نقص نہیں ہے کیونکہ ہم دین کے واسطے آئے ہیں، دنیا کے کاموں کا طریقہ جاننا نبوت کے لیے ضروری نہیں اور ان کا نہ جاننا

۲۔ من جانب اللہ دل میں یہ بات آئی

نبوت میں نقص نہیں۔ آجکل تو پیری کے واسطے بھی لوگ علم محیط[1] کو لازم سمجھتے ہیں اور بعض لوگ حضور ﷺ کے واسطے علم محیط کے قائل ہو گئے ہیں اب وہ لوگ دیکھیں کہ یہ حدیث کیا بتلا رہی ہے اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نبوت کے لیے علم محیط ضروری نہیں۔ البتہ جو علوم لوازم نبوت سے ہیں یعنی علوم ضروریہ دینیہ ان کا حصول لازم ہے غرض یہ ثابت ہو گیا کہ مباحات[2] میں بھی شریعت کو تصرف[3] کا اختیار ہے۔

ہر کام انتظام سے کرنا چاہیئے

چنانچہ اسی بناء پر ارشاد ہے "وأتوا البيوت من ابوابها" کہ گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ امر عبادات کے متعلق نہیں بلکہ عادات کے متعلق ہے اور اس میں یہ تصرف کیا کہ بدون[4] حکم شرعی کے کسی عادت کو ناجائز اور کسی کو باعث ثواب نہ سمجھو۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انتظام بھی مطلوب شرعی ہے ہر کام میں خواہ دینی کام ہو یا دنیوی۔ چنانچہ گھر میں پیچھے سے آنا خلاف انتظام ہے اس سے منع کیا گیا اور دروازہ سے آنے کا امر فرمایا گیا۔ اس میں رعایت انتظام کی تاکید ہے مگر ایک تاویل پر تو قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ تعلیم کی گئی ہے وہ تاویل یہ کہ "وأتوا البيوت من ابوابها" (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) میں بیوت عام ہو مقاصد کو اور ابواب عام ہو ان طرق کو جو ہر کام کے لیے مقرر ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ سب کاموں کو ان کے طریقوں سے کیا کرو۔ اس میں گھروں میں دروازہ سے آنا بھی داخل ہے اور ایک تاویل پر بطور قیاس کے اس پر دلالت ہو گی کہ جس طرح بیت میں باب سے داخل ہونا ایک انتظام ہے اسی طرح ہر مقصود میں اس کے طریق سے داخل ہونا ایک انتظام ہے۔

۱۔ اولین و آخرین کا علم ۲۔ جائز کاموں میں بھی ۳۔ تبدیلی ۴۔ بغیر

ایک بزرگ نے اس مضمون کو "وقدر فی السرد" (کڑیوں کے جوڑنے میں اندازے کا لحاظ رکھا کرو) اخذ کیا ہے۔

حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم فرمایا تھا کہ تم زرہ بنایا کرو مگر اس کے ساتھ یہ بھی تعلیم فرمائی "وقدر فی السرد" یعنی کڑیوں کے جوڑنے میں اندازہ کا لحاظ رکھو کہ سب متناسب اور متناسق[1] ہوں یہ نہ ہو کہ ایک بڑی اور ایک چھوٹی ہوجاوے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انتظام مطلوب ہے ہر امر میں حتیٰ کہ دنیا کے کاموں میں بھی۔ مگر اتنا فرق ہے کہ دنیا کے کاموں میں انتظام مطلوب بالذات نہیں ہے کہیں آپ دنیا ہی کو قبلہ و کعبہ بنالیں بلکہ مقصود بالذات دین کے کاموں میں انتظام ہے لیکن جب تک ہر کام میں انتظام کی عادت نہیں ہوتی اس وقت تک دین کے کاموں بھی انتظام نہیں ہوتا اس لیے دنیا کے کاموں میں اس واسطے سے انتظام مطلوب ہوگیا۔ بعض لوگ تو فطرۃً منتظم ہوتے ہیں وہ دنیا اور دین دونوں کے کام انتظام اور اصول کے ساتھ کرتے ہیں اور بعض لوگ فطرۃً غیر منتظم ہوتے ہیں ان کو بتکلف[2] انتظام کا عادی بننا چاہیئے ہر کام کے لیے وقت مقرر کرلینا چاہیئے اور وقت پر ایک کام سے فارغ ہوکر دوسرا کام کرنا چاہیئے جب آدمی اعتدال سے ہر کام کرتا ہے تو شدہ شدہ[3] انتظام پیدا ہوجاتا ہے پھر اس کا دین بھی منتظم ہوتا ہے پس دنیا کے کاموں میں اس کی ضرورت ہے جس کی طبیعت میں انتظام نہیں ہوتا وہ دین کے کام میں بھی بے ڈھنگا ہوتا ہے حضرات صوفیہ کو اس کا بڑا اہتمام ہے حضرت سلطان نظام الدینؒ کے یہاں دو شخص بیعت کے واسطے آئے آپس میں کہنے لگے کہ ہمارے یہاں کا حوض اس مسجد کے حوض سے بہت بڑا ہے سلطان جی نے سن لیا، پوچھا کتنا بڑا ہے۔ کہنے لگے یہ تو معلوم

۱۔ متناسب کے ساتھ با ترتیب ہوں ۲۔ اہتمام سے ۳۔ آہستہ آہستہ

نہیں، سلطان جی نے فرمایا کہ جاؤ ناپ کر آؤ۔ بے چارے مرتے کھپتے گئے اور جا کر اسے ناپا تو ایک بالشت بڑا نکلا۔ بڑے خوش ہوئے کہ ہماری بات بچی رہی۔ مہینہ بھر کے بعد حاضر خدمت ہوئے تو سلطان جی نے پوچھا کہ حوض کو ناپ آئے کہا حضور ہاں، فرمایا کتنا بڑا ہے بتلایا کہ ایک بالشت بڑا ہے۔ سلطان جی نے فرمایا کہ تم تو یوں کہتے تھے کہ ہمارا حوض بہت بڑا ہے ایک بالشت بڑے کو بہت بڑا نہیں کہہ سکتے تم میں تحقیق و انتظام کا مادہ نہیں ہے جاؤ تمہاری ہم سے موافقت نہ ہوگی ہم بیعت نہ کریں گے۔ اسی طرح ایک بزرگ کا معمول تھا کہ جب کوئی طالب ان کے یہاں آتا تو روٹی اور سالن معمولی خوراک سے مگر باہمی تناسب کی رعایت سے اس کے آگے بھیجتے کھانا بچنے کے بعد پھر دیکھتے سو اگر وہ مناسب انداز سے روٹی سالن چھوڑتا تب تو بیعت کر لیتے اور اگر سالن ختم کر دیا روٹی چھوڑ دی یا روٹی ختم کر گیا اور سالن چھوڑ دیا یا دونوں چیزیں چھوڑیں مگر مناسب انداز سے نہیں بلکہ روٹیاں دو ہیں تو سالن ایک ہی روٹی کا ہے یا برعکس تو اسے بیعت نہ فرماتے تھے اور کہہ دیتے کہ تمہارے اندر سلیقہ اور انتظام نہیں ہمارا تمہارا نباہ نہ ہوگا اگر آج کل کوئی شیخ ایسا برتاؤ کرے تو اس کو بد مزاج کہتے ہیں۔ بھلا ان ناقدروں سے کیا توقع کی جائے۔

ایک بزرگ سے ایک شخص نے اسم اعظم[1] کی درخواست کی تھی، انہوں نے کہا کہ تمہارے اندر چھچھورا پن ہے تم سے ضبط نہ ہوگا ظاہر کر دو گے اس لیے تم اس کے قابل نہیں وہ کہنے لگا کہ حضور اب سے میں ضبط سے کام لیا کروں گا اور چھچھورا پن چھوڑ دوں گا۔ خاموش ہو گئے ایک دن انہوں نے ایک پیالہ سرپوش سے ڈھک کر دیا کہ فلاں بزرگ کو دے آؤ مگر راستہ میں کھول کر مت دیکھنا وہ لے کر

۱۔ اکثر حضرات اللہ پاک کے اسم ذات لفظ اللہ کو ہی اسم اعظم قرار دیتے ہیں

چلا تھوڑی دیر تو اپنے نفس کو دبایا بہت ضبط کیا مگر پھر یہ خیال غالب ہوا کہ ایک نظر سے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے معلوم تو کرنا چاہیئے کہ اس میں کیا ہے آخر نہ رہا گیا اور سرپوش کھول کر دیکھا پیالہ میں سے ایک چوہا پھدک کر نکلا اور بھاگ گیا۔ اب یہ بڑے پریشان کہ اب کیا جواب دونگا، مگر ساتھ ہی یہ حیرت کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ کیا شیخ نے میرے ساتھ ہنسی کی ہے یا ان بزرگ کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ آخر کار خالی پیالہ لے کر بزرگ صاحب کے پاس پہنچے کہ مجھے فلاں صاحب نے یہ پیالہ دے کر بھیجا تھا اور سارا واقعہ بیان کیا کہ مجھے حضرت نے منع کردیا تھا کہ پیالہ کو کھولنا مت میں نے اسے راستہ میں کھول کر دیکھ لیا مجھ سے رہا نہ گیا تو اس میں سے ایک چوہا نکل کر بھاگ گیا، اب میں شرمندہ بھی ہوں اور متحیر بھی ان بزرگ نے پوچھا کہ کیا تم نے اپنے شیخ سے کوئی درخواست کی تھی۔ کہا ہاں میں نے اسم اعظم کی درخواست کی تھی، مگر انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ تمہارے اندر چھچھوراپن ہے میں نے وعدہ کیا تھا کہ اب ضبط سے کام لیا کروں گا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ یہ واقعہ تمہارے اس دعوے کا جواب ہے کہ تم سے ایک چوہے کی نگہبانی تو ہو نہ سکی تم اسم اعظم کی نگہداشت اور اس کے حقوق کی رعایت کیسے کروگے۔ وہ بیچارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

اہل اللہ لطیف المزاج ہوتے ہیں

صاحبو! یہ حضرات اہل اللہ بڑے سمجھدار ہوتے ہیں اور نازک مزاج بھی بہت ہوتے ہیں لوگوں نے بعض سلاطین[۱] کو نازک مزاج سمجھ رکھا ہے مگر وہ اہل اللہ کے سامنے کیا چیز ہیں ہم نے بزرگوں کا مشاہدہ کیا ہے تم نے مشاہدہ نہ کیا ہو تو تکذیب[۲] کرسکتے ہو۔ اہل اللہ میں ذکر کی وجہ سے بہت لطافت آجاتی ہے اس

۱۔ بادشاہوں ۲۔ جھٹلا سکتے ہو

لیے ان کا مزاج بہت لطیف و نازک ہو جاتا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ ایک مرتبہ صبح کو سو کر اٹھے تو آنکھوں میں سرخی تھی لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ رات سردی لگی اس لیے نیند نہ آئی، ایک مریدنی ضعیفہ حاضر تھی حاضرین سے کہا کہ کوئی صاحب فکر نہ کریں اس کا اہتمام میں کروں گی۔ چنانچہ اٹھ کر گئی اور دن بھر میں ایک دولائی تیار کر کے رات کو لائی آپ اس وقت لیٹ گئے تھے۔ فرمایا میرے اوپر ڈال دو وہ ڈال کر چلی گئی۔ صبح کو پھر آنکھیں سرخ تھیں۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی، فرمایا رات سردی تو نہیں لگی مگر نیند پھر بھی نہ آئی کیونکہ دولائی میں تگندے[1] ٹیڑھے پڑے تھے اس سے طبیعت کو بار بار الجھن ہوتی تھی بھلا ایسا ادراک کہیں سلاطین کا بھی ہوا ہے کہ دولائی اوڑھ کر اندھیرے میں تگندوں کا ٹیڑھا ہونا معلوم ہو جاوے[2]۔

ہمارے استاد (مولانا محمد یعقوب صاحبؒ) کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نانوتہ سے کہیں جانے والے تھے۔ مولانا کی سواری کے لیے چھکڑا[3] لایا گیا یہ تو سادگی تھی یہ حضرات لطیف المزاج ہونے کے ساتھ سادے بھی ہوتے ہیں۔ تصنع اور تکلف کا نام لطافت نہیں ہے۔ یہ حضرات سادے تو غریبوں سے زیادہ تھے اور لطیف المزاج بادشاہوں سے زیادہ۔ چنانچہ یہ تو سادگی تھی کہ سواری کے لیے چھکڑا آیا اس کے بعد جو مولانا کا اسباب[4] آیا تو رضائی اس طرح تہ کی ہوئی تھی کہ ابرہ[5] اوپر اور استر[6] اندر کسی نے یہ سمجھ کر کہ غلطی سے اس طرح ہو گئی ہوگی استر اوپر کر دیا اور ابرہ اندر۔ کیونکہ عموماً ابرہ کی حفاظت زیادہ کی جاتی ہے کہیں میلا

۱۔ دھاگے ۲۔ بادشاہوں کو کہاں ایسا احساس ہوتا ہے کہ رات کے اندھیروں میں رضائی میں دھاگوں کا ٹیڑھا ہونا معلوم ہو ۳۔ بیل گاڑی ۴۔ سامان ۵۔ رضائی کے اوپر لگنے والا کپڑا
۶۔ رضائی کے اندر لگنے والا کپڑا

نہ ہوجائے۔ مولانا نے جو آکر دیکھا فرمایا یہ کون عقلمند ہیں جنہوں نے استر اوپر کردیا، ان منتظم صاحب نے عرض کیا حضرت طریقہ اس کا یہی ہے تاکہ ابرہ گرد آلود نہ ہوجاوے۔ فرمایا خوب سمجھے جب سارا گردوغبار استر پر پڑے گا تو رات کو اوڑھتے وقت وہ ہمارے دماغ میں نہ پہنچے گا ابرہ کو اوپر کرو۔ اس پر اگر گرد پڑے گی تو بہت سے بہت دیکھنے میں برا معلوم ہوگا مگر ہمارا دماغ تو گرد سے محفوظ رہے گا تم نے ہمارے دماغ سے زیادہ ابرہ کی حفاظت کی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ حقیقت میں حکماء یہ لوگ ہیں اور لطافت ان کے اندر ہے رؤساء اور نوابوں کو تو محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ اہل اللہ سے زیادہ سلیقہ دنیاوالوں کو بھی نہیں ہوتا گو ان حضرت کو تجربہ نہ ہو۔

تجربہ اور سلیقے میں فرق

تجربہ اور چیز ہے سلیقہ اور چیز ہے۔ میں نے یہ اس واسطے کہدیا کہ کہیں آپ چار پائی بننے کے لیے ان کو نہ دیدیں کہ ہم نے سنا تھا کہ اہل اللہ کو دنیاوالوں سے زیادہ سلیقہ ہر کام کا ہوتا ہے۔ بس آپ چار پائی خوب بنیں گے۔ تو صاحبو! اہل اللہ کو سلیقہ تو ہوتا ہے مگر تجربہ نہیں ہوتا اور بعض کاموں کے لیے سلیقہ کافی نہیں ہوتا بلکہ تجربہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

بجنور میں ایک شخص نے ایک عالم کا رد لکھا لوگوں نے اس سے کہا کہ تم تو جاہل ہو تم نے مولوی صاحب کا رد کیا خاک لکھا ہوگا وہ کہنے لگا کہ میں نے فارسی پڑھی ہے اور اس سے سب کچھ آجاتا ہے تو اس شخص نے چار پائی اس کے حوالہ کی کہ ذرا اس کو بھی بن دو اس نے کہا کہ یہ کام تو مجھے نہیں آتا، وہ بولا کہ بس اسی برتہ پر دعویٰ کرتے ہو کہ فارسی سے سب کچھ آجاتا ہے۔ تو مجھے ڈر ہے کہ میرے کلام کے بھی کہیں یہی معنیٰ نہ سمجھے جائیں اس لیے میں نے بتلادیا کہ تجربہ اور چیز ہے

سلیقہ اور ہے۔ علماء وطلبہ کو واقعی تجربہ دنیا کے کاموں کا نہیں ہوتا جس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کو ان کاموں کی نوبت[1] کم آتی ہے۔

کانپور میں ایک عربی خواں طالب علم سے ایک انگریزی خواں نے سوال کیا کہ بتلاؤ ثوابت[2] کی شمار کیا ہے انہوں نے کہا کہ مرصودہ[3] کا عدد تو لکھا ہے کہ ایک ہزار بائیس ہیں مگر غیر مرصودہ معلوم نہیں وہ بولا بس یہی ریاضی پڑھی ہے اس نے سائل سے یہ سوال کیا کہ اچھا آپ بتلادیں کہ سمندر میں مچھلیاں کتنی ہیں اور یہ سوال زمین کا ہے اور آپ کا سوال آسمان کا ہے پہلے آپ زمین کا حال بتلادیں تو میں بھی آسمان کا حال بتلادوں گا۔ اب خاموش ہیں طالب علم نے کہا بس یہی جغرافیہ پڑھا ہے آج کل یہ بھی ایک مرض ہے کہ مولویوں سے اینڈے بینڈے سوالات کرتے ہیں اور اگر ان سے جواب نہ آئے تو ان کے علم پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے کیا خاک پڑھا ہے اتنی بات کا تو جواب نہ دے سکے سبحان اللہ اسی لیے تو علماء نے پڑھا لکھا ہے کہ آپ کے واہیات سوالات کو حل کیا کریں ان سے احادیث و آیات کا مطلب پوچھو مسائل و احکام واقعات کا جواب لو۔ الغرض دنیا کے کاموں کا تجربہ تو ان کو ضروری نہیں مگر سلیقہ اور تہذیب اور انتظام ان میں اس قدر ہوتا ہے کہ واللہ اہل دنیا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی جس کا امتحان اس طرح ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص ان کے پاس تھوڑے دن رہ کر دیکھ لے اور وہ شخص ایسا ہو جس کو اپنے مہذب اور سلیقہ دار اور منتظم ہونے کا دعویٰ ہو اور اپنے کو بڑا عاقل سمجھتا ہو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ اپنے کو بے وقوف کہہ کر نہ اٹھے تو کوئی بات نہیں تھوڑے ہی عرصہ میں اس کو اپنی تہذیب کا بد تہذیبی ہونا اور اپنے انتظام کا غلط ہونا مشاہدہ ہوجائے گا۔

۱۔ ضرورت کم پیش آتی ہے ۲۔ سیاروں کے علاوہ جو ستارے ہیں ان کو ثوابت کہتے ہیں
۳۔ مطلب یہ ہے کہ ثوابت کی تعداد کیا ہے

ہر کام اس کے طریقہ سے کرنا چاہیے

تمہید میں وقت زیادہ گذر گیا اب میں مقصود کی طرف عود[۱] کرتا ہوں میں نے شروع میں کہا تھا اور پھر عنقریب ہی ضمناً بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اس آیت کے دو محل ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اس کا تعلق خاص رسم جاہلیت سے ہو جو حج کے متعلق تھی اور اس صورت میں ماقبل سے اس کا ارتباط[۲] ظاہر ہے کہ اوپر فوائد ہلال[۳] میں حج کا ذکر تھا اور اس موسم کا تعلق بھی حج سے ہے۔ دوسرا محل یہ کہ بطریق استعارہ[۴] کے اس میں مطلقاً ہر فعل کو صحیح طریق سے کرنے کی تعلیم ہو اور اس صورت میں ربط[۵] کے متعلق سوال ہوتا ہے کہ اس سے پہلے "یسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس والحج" . (لوگ آپ سے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرما دیجیے کہ اس کا گھٹنا بڑھنا لوگوں کے کاروبار اور حج کے اوقات کے لیے ہے) مذکور ہے تو اس سے "ولیس البر بان تاتوا البیوت" (یہ کوئی نیک کام نہیں ہے گھروں میں تم پچھواڑوں سے آؤ) کو کیا ربط ہے۔ سو وہ ربط یہ ہے کہ ماقبل میں چاند کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ صحابہؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کی کیا وجہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں وجہ اور علت نہیں بیان کی گئی بلکہ حکمت بتلادی گئی اس سے سائنس دانی کا فضول ہونا یقیناً ثابت ہو گیا پہلے حافظ کے شعر سے اس کا فضول ہونا معلوم ہوا تھا اب خود قرآن سے معلوم ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ لوگ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اس کی علت کیا ہے تو آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ چنانچہ اس سے لوگوں کو اپنے کاروبار کے لیے وقت کا اندازہ ہوتا ہے (یہ تو دنیوی نفع ہے) اور حج وغیرہ

۱۔ لوٹتا ہوں ۲۔ تعلق ۳۔ چاند ۴۔ کنارہ ۵۔ پچھلی آیت سے اس کا تعلق کیا ہے

کے اوقات معلوم ہوتے ہیں یہ دینی نفع ہے۔ تو علت کو چھوڑ کر حکمت بتلانے میں اس پر تنبیہ کردی گئی کہ علت کا دریافت کرنا فضول ہے حکمت کو معلوم کرنا چاہیئے اس کے بعد ارشاد ہے "ولیس البر بانْ تاتوا البیوت من ظھورھا" (اور گھروں میں پشت کی طرف سے آنا کچھ نیک کام نہیں بلکہ نیک کام تقویٰ کا اختیار کرنا ہے) پس اس کا تعلق سابق[۱] سے یہ ہوا کہ سوال بر محل اور بے محل[۲] کی مثال ایسی ہے جیسے گھر میں دروازہ سے داخل نہ ہونا اور پشت کی طرف سے داخل ہونا۔ پس جس طرح گھر میں بغیر دروازہ کے آنا برا ہے اسی طرح سوال بے محل بھی برا ہے آگے فرماتے ہیں۔ "واتوا البیوت من ابوابھا" اور گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ یعنی سوالات بھی بر محل کیا کرو بے محل سوال نہ کیا کرو پس اس صورت میں "واتوا البیوت من ابوابھا" (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) حکم عام ہوگا اس کو خاص اس واقعہ ہی سے تعلق نہیں ہوگا جو اہل جاہلیت میں رائج تھا کہ وہ حالت احرام میں دروازہ سے گھر میں آنا برا سمجھتے تھے بلکہ ایک عام قاعدہ کا بیان ہوگا کہ ہر کام کو اس کے طریقہ سے کیا کرو جس میں وہ واقعہ بھی داخل ہوگیا اور تبعاً اس کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ احرام میں غیر دروازہ سے آنا نیک کام نہیں پس پہلی تفسیر پر تو "واتوا البیوت من ابوابھا" (گھروں میں دروازہ سے داخل ہوا کرو) میں اہل جاہلیت کے خاص فعل کا حکم مذکور تھا اور دوسری تفسیر پر یہ حکم عام ہوگا اور میرا مقصود جس کو اس وقت بیان کرنا منظور ہے اس دوسری تفسیر پر تو آیت کا مدلول[۳] بلاواسطہ ہے اور پہلی تفسیر پر چونکہ بواسطہ قیاس اس سے مستنبط ہوتا ہے اس لیے مدلول بواسطہ ہے اور وجہ قیاس ظاہر ہے کہ "ایتان بیوت من

۱۔ پہلے ۲۔ باموقع اور بے موقع سوال کی مثال

۳۔ جس حکم کو بیان کر رہے ہیں اس پر یہ آیت بغیر واسطے دلالت کرتی ہے یعنی اس سے یہ حکم نکلتا ہے

الظھور" (مکانوں میں پشت سے آنا) ایک بے موقع فعل ہے اور اس لیے مذموم[۱] ہے پس ہر فعل بے موقع مذموم ہوگا اب مستدل[۲] کو اختیار ہے کہ جس تفسیر سے چاہے مقصود کو ثابت کردے۔ ایک گدام بھرا ہوا ہے ہم کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں کھانا شروع کردیں مصری کی ڈلی ہے جدھر سے چاہو منہ[۳] مارلو۔ الغرض دونوں صورتوں میں باختلاف توجیہ آیت سے مستفاد ہوا کہ بے طریقہ اور بے محل اور خلاف قاعدہ کام مت کرو بلکہ ہر کام کو اس کے طریقہ سے کرو اور دنیا کے معاملات میں تو سب لوگ اس قاعدہ کو تسلیم کرتے ہیں مگر مجھ کو یہ بتلانا ہے کہ دین کے بارہ میں لوگ اس قاعدہ کو بالکل چھوڑے ہوئے ہیں چنانچہ آجکل دیکھا جاتا ہے کہ اول تو لوگوں کو دین پر توجہ ہی نہیں حتیٰ کہ بعض لوگ تو دین کو مانع ترقی سمجھتے ہیں اس لیے اس سے آزاد ہونے کی رائے دیتے ہیں ان لوگوں سے تو مجھ کو خطاب نہیں نہ یہ قابل خطاب ہیں کیونکہ اس وقت مسلمانوں کو خطاب ہورہا ہے بددینوں کو خطاب نہیں ہورہا اور یہ لوگ مسلمان نہیں بددین ہیں اس لیے ان لوگوں کی میں شکایت نہیں کرتا کیونکہ شکایت اپنوں کی ہوا کرتی ہے غیروں سے کیا شکایت مجھے اصلی شکایت ان لوگوں سے ہے جو واقع میں مسلمان ہیں اور ان کو دین پر توجہ بھی ہے اور وہ دین پر توجہ کرنے کو ضروری بھی سمجھتے ہیں ان کی یہ شکایت ہے کہ یہ لوگ بھی دین کو اس کے طریقہ سے حاصل کرنا نہیں چاہتے بے قاعدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

بعض لوگ نماز روزہ بھی دنیا کے لیے کرتے ہیں

چنانچہ بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ دین پر دنیا کے لیے توجہ کرتے

۱۔ برا ۲۔ دلیل پکڑنے والے ۳۔ کھالو

ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں، تہجد کو اٹھتے ہیں وظیفے پڑھتے ہیں اور مقصود یہ ہے کہ اسی ذریعہ سے ہمارے مقدمات میں آسانی ہوجائے ہم کو رزق میں فراخی حاصل ہو کیونکہ کسی مولوی سے سن لیا تھا کہ گناہوں سے روزی میں تنگی ہوجاتی ہے، مصائب نازل ہوتے ہیں تو یہ لوگ محض اسی غرض سے دین دار بنے ہوئے ہیں کہ دنیا کے کام چلتے رہیں جیسے ایک گنوار سے کسی مولوی صاحب نے کہا تھا کہ تو نماز کیوں نہیں پڑھتا۔ اس نے کہا کہ نماز سے مجھے کیا ملے گا مولوی صاحب نے کہا کہ چالیس دن کے بعد تجھے ایک بھینس دوں گا اس نے نماز شروع کردی اور دن گننے لگا گویا بھینس ہی میں فنا ہوگیا اسی سے اس کی حالت معلوم ہوگئی کہ اس کو نماز مقصود نہ تھی جب چالیس دن پورے ہوگئے تو مولوی صاحب کے پاس گیا کہ لاؤ وعدہ پورا کرو انہوں نے کہا کہ جا کیسی بھینس لیے پھرتا ہے میں نے تو اس واسطے کہدیا تھا کہ جو شخص چالیس دن تک نماز پڑھتا رہتا ہے اسے شوق ہوجاتا ہے میں نے سوچا کہ اس بہانہ سے تجھے نماز کا شوق ہوجاوے گا یہ جواب سن کر وہ گنوار کیا کہتا ہے کہ جاؤ پھر یاروں نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی[1] بس پھر نماز چھوڑ دی۔ اور چونکہ اس ظالم نے بے وضو ہی ٹرخائی تھی اس لیے اس کو شوق بھی نہ ہوا بھلا ایسی نماز کیا اثر کرتی اس حکایت پر تو لوگ ہنسے مگر صاحبو! ہم جیسے بھی سب اسی میں مبتلا ہیں ہمارے اس ہنسنے کی ایسی مثال ہے۔

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(بے وقوف اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسے کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

غور کرکے ایسا شخص دیکھ لے کہ اس کو دین کے کاموں میں دنیا مقصود ہے یا نہیں بعض لوگ جب تک تنگیٔ معاش میں مبتلا رہتے ہیں اس وقت تک

۱۔ بے وضو ہی پڑھی ہے

نمازی اور روزہ دار ہوتے ہیں پھر جہاں فراخی میسر ہوئی اور انہوں نے ان کاموں کو بالائے طاق رکھا گویا دین کو محض دنیا کے لیے اختیار کیا تھا جب وہ حاصل ہو گئی پھر دین کی کیا ضرورت رہی بعض لوگ دین کو اس لیے اختیار کیے ہوئے ہیں کہ ان کو اس کے ذریعے سے جاہ وعزت حاصل ہے لوگ دین دار اور مقتدا سمجھتے ہیں تعظیم وتکریم کرتے ہیں اگر وہ دین داری کے کام چھوڑ دیں تو یہ منافع فوت ہو جاویں گے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور تماشا ہے وہ یہ کہ بعض لوگ دنیا کے قصد سے دین کا وہ جزو اختیار کرتے ہیں جس کو خود بھی دین نہیں سمجھتے، جانتے ہیں کہ یہ دین کے کام نہیں سراسر دنیا ہے مگر اپنی اغراض حاصل کرنے کے لیے دوسروں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ دین ہے یہ صورت پہلی صورت سے بھی بد تر ہے کیونکہ گو دونوں جگہ مقصود دنیا ہی ہے اور اس کے لیے دین کو ذریعہ بنایا گیا ہے مگر پہلی صورت میں تو ایسے دین کو ذریعہ بنایا گیا تھا جس کو دین تو سمجھتے تھے تو نیت ہی میں فساد ہوا دین میں تو تغییر نہیں کی اور دوسری صورت میں ایسے دین کو ذریعہ بنایا گیا ہے جس کو خود بھی دین نہیں سمجھتے مگر مخلوق کو دھوکہ دینے کے لیے اسے دین میں ٹھونسنا چاہتے ہیں تو اس میں فساد نیت اور تغییر دین[1] دونوں ہیں۔ چنانچہ آجکل ایسے بہت کام کیے جاتے ہیں جن کو دین سے کچھ تعلق نہیں ایسے علماء خوب جانتے ہیں کہ یہ محض دنیا ہے مگر نہایت بے باکی کے ساتھ ان کو دین بنایا جاتا ہے۔

بلا عمل ثمرہ کی امید رکھنا بے وقوفی ہے

اب میں ان دنیا داروں کی شکایت چھوڑتا ہوں صرف مخلص دینداروں کی ایک حالت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آجکل بعضے لوگ جو دیندار ہیں ان میں یہ مرض

۱۔ دین میں تبدیلی

ہے کہ وہ دین کے کام کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا طریقہ معلوم نہیں کرتے۔ تو ان کی ایسی مثال ہے کہ مکان بنانا چاہتے ہیں مگر گارے اینٹ کی فکر نہیں۔ کاشت کرنا چاہتے ہیں مگر تخم[۱] وغیرہ سامان جمع کرنے کی تدبیر نہیں یوں چاہتے ہیں کہ بے گارے اینٹ کے مکان بن جائے اور بدوں[۲] تخم کے کاشت ہو جائے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایسا بے ڈھنگا طریقہ اختیار کرتے ہیں جس سے پہلا جمع کیا ہوا ذخیرہ بھی برباد ہو جائے۔ خدا تعالیٰ سے اگر ان کو کچھ تعلق ہوا بھی تھا وہ ان کی خرافات سے زائل ہو جاتا ہے ان کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص نے قرض لے کر مکان بنایا تھا جب قرض خواہ نے تقاضا کیا تو اس نے غصہ میں آکر سار مکان ہی ڈھا دیا کہ جاؤ ہم نے تمہارے قرض کا مکان ہی نہیں رکھا اب لیلو کہاں سے لو گے قرض خواہ نے اس کی نالش[۳] کردی روپیہ بھی دینا پڑا اور گھر بھی برباد ہوا۔ غرض کام کا طریقہ نہ اختیار کرنے سے یہ لوگ اپنا پہلا سرمایہ بھی برباد کر رہے ہیں صاحبو! دنیا میں جو شخص ایسی بے اصولی کرتا ہے اس کو سب احمق کہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ دین میں ایسی بے اصولی کرنے والے کو نہ کوئی دوسرا احمق کہتا ہے نہ وہ خود اپنے کو احمق سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کا مصداق ہے کہ۔

دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست (دماغ بے ہودہ پکایا خیال باطل باندھا)

افسوس کھیتی کی امید اور اسباب سے غفلت یہ کونسی عقلمندی ہے دنیا میں اگر کوئی کھیتی کی امید کرتا ہے تو وہ اسباب کو اختیار کرتا ہے اور یوں کہتا ہے کہ۔

رزق ہر چند بیگماں برسد لیک شرط ست جستن از درہا

(رزق بے شک ملے گا لیکن اس کو اسباب سے تلاش کرنا شرط ہے)

کہ رزق ہر چند بے گمان پہنچتا ہے مگر اس کا دروازوں پر تلاش کرنا شرط ہے جستن

۱۔ بیج ۲۔ بغیر بیج ۳۔ اس پر مقدمہ قائم کردیا

از در با سے بھیک مانگنا مراد نہیں بلکہ یہ "ؤاتو البیوت من ابوابہا" (گھروں میں دروازوں سے آؤ) کا ترجمہ ہے کہ اسباب عادیہ کا اختیار کرنا اور طریقہ سے کام کرنا شرط ہے یہ مطلب گلستان پڑھانے والوں کے ذہن میں بھی نہ آیا ہوگا اور میری سمجھ میں بھی آج ہی آیا ہے مولانا بھی اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

اطلبوا الارزاق من اسبابہا　　　وادخلوا ابیات من ابوابہا

(روزی کو اس کے اسباب سے طلب کرو اور گھروں میں دروازوں سے داخل ہو) یعنی جس طرح روزی کو اسباب سے تلاش کیا جاتا ہے اسی طرح ہر کام کو اس کے قاعدہ سے کرنا چاہیئے۔ افسوس آج کل اکثر دینداروں کی حالت یہ ہے کہ وہ دین کو دین کے قاعدہ سے نہیں حاصل کرتے ہر شخص اپنے اجتہاد پر عمل کر رہا ہے حالانکہ جب کام خلاف قاعدہ ہوتا ہے تو اس کے ثمرات حاصل نہیں ہوسکتے۔ دیکھیئے اگر کھیتی کا قصد ہو اور اسباب اس کے اختیار نہ کیے جائیں تو ثمرہ حاصل نہیں ہوسکتا اور اس حالت میں اس کا امیدوار ہونا کہ مجھے پیداوار ملے گی سراسر بیوقوفی ہے یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو دین کے اسباب اختیار نہیں کرتے اور ثمرات کے امیدوار ہیں۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں رجاء[1] وغرور میں بھی فرق بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جب اعمال کی اصلاح کرکے اور اعمال صالحہ پر مداومت[2] کرکے خدا تعالیٰ سے امید رکھی جاوے تو یہ رجاء ہے اور جو شخص بدون اکتساب[3] اعمال کے بلکہ باوجود ارتکاب[4] معاصی کے امیدوار ثواب کا ہو وہ غرور میں مبتلا ہے۔ پس رجاء صحیح وہ ہے جس کے ساتھ اعمال پر مداومت بھی ہو مگر افسوس ہے کہ لوگوں نے دین میں توکل و تقدیر بمعنی تعطل[5] کا نام رجاء رکھ لیا ہے کہ نہ

۱۔ امید　　۲۔ ہمیشگی　　۳۔ بغیر عمل کے　　۴۔ گناہوں کو کرنے کے ساتھ

۵۔ بے کار چھوڑ دینے کا نام

نماز پڑھتے ہیں نہ اعمال صالحہ کی فکر کرتے ہیں نہ ان کے بجالانے کا طریقہ دریافت کرتے ہیں نہ معاشرت و معاملات کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور دعویٰ کرتے ہیں توکل کا کہ ہم کو خدا پر بھروسہ ہے اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں خدا تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ بخش دیں گے اور دنیا کے کاموں میں جب ان سے توکل کو کہا جاتا ہے تو وہاں یوں کہتے ہیں کہ توکل برحق لیکن پہلے اسباب کو اختیار کر لینا چاہیئے اسباب کو اختیار کر کے پھر خدا پر توکل کرنا چاہیئے دنیا کے کاموں میں تو یہ شعر یاد کر رکھا ہے۔

گفت پیغمبر باواز بلند　　　　بر توکل زانوئے اشتر بہند

(نبی کریم ﷺ نے باواز بلند فرمایا ہے توکل پر اونٹ کا پاؤں باندھ دو)

گر توکل میکنی در کار کن　　　　کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

(اگر تم توکل کرتے ہو تو کاموں میں توکل کرو کسب کرو اور بھروسہ اللہ تعالیٰ پر کرو)

چنانچہ کوئی شخص بدون بیل خریدے اور ہل چلائے کھیتی نہیں کرتا یہاں ہر شخص اسباب کو اختیار کرنے کی رائے دیتا ہے اور جو اس کے بغیر ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے کھیتی کا طالب ہو اسے سب بیوقوف بناتے ہیں مگر اے اللہ! دین کے بارے میں یہ ساری عقلیں کیوں مسخ ہو گئیں وہاں توکل[۱] بمعنیٰ تعطل کیوں سوجھتا ہے بلکہ دنیا کے بارہ میں تو بعض لوگ اسباب کی ضرورت کے ایسے معتقد ہیں کہ ان کے بعد خدا تعالیٰ کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے ہمارے یہاں ایک شخص زمیندار ہے اس کا بیٹا نیک ہے نماز روزہ کا پابند ہے ایک دن وہ لڑکا نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کر رہا تھا تو اس کا تایا کہنے لگا کہ یہ لڑکا نماز کے بعد ہاتھ پھیلا پھیلا کر خدا

۱۔ اللہ پر بھروسہ کرنے کو یہ سمجھنا کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھا رہے اور کچھ نہ کرے یہ دین ہی میں کیوں خیال آتا ہے

سے کیا مانگتا ہے اس کو کس چیز کی کمی ہے۔ اناج اس کے گھر میں بھر رہا ہے، بیل اس کے یہاں ہیں، روپے کی اسے کمی نہیں پھر خدا سے کیا مانگتا ہے۔ تو یہ تو یہ اس شخص کے نزدیک بس ان چیزوں کے بعد خدا کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ بھلا اگر خدا تعالیٰ غلہ میں آگ لگادے اور بیلوں کو ماردے اور رقم چوری ہوجائے تو یہ شخص کیا کرلے گا اسی طرح ایک ہمارے ملنے والے ایک جنٹلمین کی حکایت بیان کرتے تھے کہ انہوں نے ایک شخص کو کسی کام کے لیے کہا اس نے کہا کہ یہ کام کل کو ان شاء اللہ تعالیٰ ہوجائے گا وہ جنٹلمین کہتے ہیں کہ اس میں خدا کے چاہنے کا (یہ انگریزی طرز کی تقلید ہے) کیا بات ہے بس تم کل کو یہ کام ضرور کردینا۔ خدا ان لوگوں کی عقلیں بالکل مسخ ہوگئی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آج ہی کوئی دشمن کسی نزاع کی وجہ سے ایک گولی میں اس کا کام تمام کردے اور ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں چنانچہ ان صاحب کا یہی انجام ہوا اور سب سامان حفاظت رکھا رہ گیا تو اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ ان شاء اللہ کہنے کی کیسی ضرورت ہے پھر تو شاید وہ ہر بات میں ان شاء اللہ کہیں گے۔ یا دفعتاً[۲] پیٹ میں درد ہو اور ہیضہ سے رات ہی کو جان نکل جاوے یا سانس گھٹ کر مرجاوے تو کیا ہو۔ بھلا انسان کی ہستی ہی کیا ہے جس پر یہ غرور کرتا ہے میاں کی ساری زندگی کا مدار ذرا سے سانس پر ہے جہاں سانس بند ہوئی اور قصہ ختم۔ اور سانس بند ہونے کے لیے کھانا پانی ہی کافی ہے۔ بعض لوگ کھانا کھاتے ہوئے لقمہ اٹک جانے سے مرگئے اگر ان جنٹلمین صاحب کو ایسا واقعہ پیش آجاوے تو پھر وہ ہر بات میں ان شاء اللہ کہنے لگیں گے جیسے ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ گھوڑا خرید نے جارہا تھا کسی دوست سے راستہ میں ملاقات ہوئی پوچھا کہاں جارہے ہو کہا گھوڑا خریدوں گا اس نے کہا ان شاء اللہ کہہ لو وہ بولا کہ اس میں

۲- اچانک

ان شاء اللہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھوڑا بازار میں ہے اور روپے جیب میں ہیں اب جاؤں گا اور تھوڑی دیر میں خرید لاؤں گا چنانچہ آپ چلے تو راستہ میں کسی جیب کٹ نے جیب میں سے روپے اڑا لیے۔ اب جو آپ گھوڑا خرید نے کے لیے دام[1] نکالتے ہیں تو وہاں صفایا ہے نادم و پشیمان[2] ہو کر واپس ہوا۔ راستہ میں پھر اسی دوست سے ملاقات ہوئی اس نے پوچھا کہو گھوڑا خرید لائے تو آپ کہتے ہیں کہ ہم گھوڑا خریدنے گئے تھے ان شاء اللہ جیب میں اتنے روپے تھے ان شاء اللہ چور نے جیب کاٹ لی ان شاء اللہ روپیہ چرالیا ان شاء اللہ اب ہم خالی ہاتھ لوٹ رہے ہیں ان شاء اللہ۔ اب آپ جوڑ بے جوڑ ہر بات میں ان شاء اللہ ہی کہنے لگے۔ اور یہ جواں جنٹلمین صاحب نے کہا تھا کہ اس میں خدا کے چاہنے کی کیا بات ہے یہ اثر سائنس کا ہے۔

اسباب مؤثر بالذات نہیں

آج کل مسلمانوں نے سائنس والوں کی کاسہ لیسی[3] کی ہے کہ جس طرح وہ محض اسباب پر نظر کرتے ہیں یہ بھی اسباب پر نظر کرتے ہیں۔ مگر تھوڑا سا فرق ہے اسی لیے میں نے یہ کہا کہ ان لوگوں نے سائنس والوں کی کاسہ لیسی کی ہے وہ فرق یہ ہے کہ اہل سائنس تو خدا کے بھی منکر ہیں اور یہ لوگ خدا تعالیٰ کو خالق و مؤثر مانتے ہیں۔ اہل سائنس فطرۃ اور طبیعت کو مؤثر حقیقی جانتے ہیں یہ لوگ فطرت کو مؤثر حقیقی نہیں مانتے بلکہ فطرت کو خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں مگر یوں کہتے ہیں کہ بس خدا نے فطرت کو پیدا کر کے اس میں تاثیر رکھدی ہے اب خدا کے تصرف کی کچھ ضرورت نہیں جو کچھ ہوتا ہے فطرت اور اسباب کے ذریعہ سے ہوتا ہے جیسے گھڑی کا چلنا کو کنے[4] والے کا محتاج ہے مگر کوک[5] بھر دینے کے بعد اب اس کو

۱۔ قیمت ۲۔ شرمندہ ۳۔ پیروی ۴۔ چابی دینے والے ۵۔ چابی

چوبیس گھنٹہ تک کوکنے والے کی ضرورت نہیں وہ خود بخود چلتی رہے گی بلکہ کوک بھر دینے کے بعد اگر تم اس کو روکنا بھی چاہو تو وہ رک نہیں سکتی اسی طرح یہ لوگ خدا کی ضرورت محض کوکنے کے واسطے سمجھتے ہیں اور کوکنے کے بعد خدا کی ضرورت نہیں سمجھتے ان کا خیال یہ ہے کہ خدا نے فطرت اور اسباب کو پیدا کر کے ان میں تاثیر رکھ دی اب سارے کام اسباب ہی سے ہوتے ہیں خدا کے تصرف کی کچھ ضرورت نہیں مگر یہ خیال بالکل باطل ہے مشاہدہ اس کی تکذیب[۱] کرتا ہے اگر اسباب میں ایسی تاثیر ہوتی کہ خدا کے چاہنے کو اس میں کچھ دخل نہ رہتا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ دوا سے بعض دفعہ نفع نہیں ہوتا بلکہ الٹا ضرر[۲] ہونے لگتا ہے۔ مولانا ایک حکایت میں فرماتے ہیں۔

از قضا سر کنگبیں صفرا فزود　　　روغن بادام خشکی مے نمود

از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت　　　آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

(قضا سے شہد نے صفرا بڑھایا اور روغن بادام خشکی کرتا تھا اور ہلیلہ سے قبض ہوا پانی مثل تار کول کے آگ کو تیز کرتا تھا[۳]۔

اطبا رات دن اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک دوا ایک مرض کے لیے نافع[۴] ہے مگر بعض دفعہ وہ دوا اس مرض کو بڑھانے لگتی ہے نیز اس کی کیا وجہ کہ بعض لوگوں کو کسب[۵] سے معاش نہیں ملتی۔ دو شخص برابر سرمایہ سے تجارت کرتے ہیں اور ان میں ایک عاقل ہوتا ہے ایک بیوقوف مگر مشاہدہ ہے کہ بعض دفعہ عاقل کی تجارت نہیں چلتی بیوقوف کی چل جاتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسباب محض برائے نام بہانہ ہیں ورنہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مشیت[۶]

۱۔ مشاہدہ اس کو جھٹلاتا ہے　۲۔ نقصان　۳۔ غرض ہر دوا جو جس مرض کے لیے مفید ہوتی ہے اسی مرض میں زیادتی کا باعث ہوگی　۴۔ فائدہ مند　۵۔ کمانے سے　۶۔ خدا کے چاہنے سے

سے ہوتا ہے۔

میں نے ایک شہر میں ایک رئیس کو دیکھا ہے کہ پہلے وہ چھ پیسے کے مزدور تھے پھر ریلوے میں نوکر ہوگئے پھر ریلوے کے ٹھیکے لینے لگے حتیٰ کہ ترقی کرتے کرتے ہزاروں لاکھوں کے آدمی ہوگئے کہ بڑے بڑے بی۔ اے، ایم۔اے کی ڈگری پاس کرنے والے ان کے یہاں ملازم تھے اور وہ خود اپنے دستخط بھی نہ کرسکتے تھے اگر ترقی کا مدار محض اسباب پر ہے تو ذرا تم کسی دوسرے کو تو چھ پیسہ کی مزدوری سے لاکھوں ہزاروں کا آدمی بنادو۔ اور جس طرح اس رئیس نے ترقی کی ہے اس کو بھی وہی ذرائع بتلادو۔ یقینی بات ہے کہ ہر شخص ان ذرائع سے ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ ہر شخص رات دن مشاہدہ کرتا ہے کہ آج وہ ایک کام کا ارادہ کرتا ہے جو پورا ہوجاتا ہے کل کو پھر اسی کام کا ارادہ کرتا ہے اور پورا نہیں ہوتا۔ اسی لیے ایک بزرگ فرماتے ہیں "عرفت ربی بفسخ العزائم" کہ میں نے خدا تعالیٰ کو ارادوں کے ٹوٹنے اور ناکام رہنے سے پہچانا کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ارادہ سے کچھ نہیں ہوتا کوئی دوسرا کام کرنے والا ہے۔

رجاء کے معنیٰ

الغرض یہ خیال جو بعض مسلمانوں میں سائنس والوں کی صحبت سے پیدا ہوا ہے کہ اسباب ہی سے سب کچھ ہوتا ہے غلط اور بالکل غلط ہے مگر مجھ کو یہ بتلانا ہے کہ یہ لوگ باوجودیکہ اسباب کے ایسے معتقد ہیں مگر دین کے بارہ میں یہ بھی اسباب کو اختیار نہیں کرتے۔

پس صحیح راستہ یہ ہے کہ نہ اسباب کو مؤثر سمجھے نہ ان کو فضول خیال کرے عادۃ اللہ یہ ہے کہ اسباب گو مؤثر[1] نہیں مگر جو ان کو اختیار کرتا ہے حق تعالیٰ اس

۱۔ اثر نہیں کرتے

کی مدد فرما دیتے ہیں۔ اور جو شخص اسباب کو اختیار نہیں کرتا اس کی ناکامی کا یہ سبب نہیں کہ اسباب مؤثر تھے اور وہ نہیں پائے گئے بلکہ ناکامی کا راز یہ ہے کہ اکثر خدا کی اعانت[۱] اسباب اختیار کرنے کے بعد ہوا کرتی ہے اور بدون[۲] اس کے نہیں ہوتی۔ پس اس نے خدا کی اعانت کو حاصل نہیں کیا۔ خوب سمجھ لو پس اسباب کو جمع کر کے ثمرات کی امید کرنا رجاء[۳] ہے اور بدون اسباب اختیار کیے امید رکھنا غرور ہے۔ جیسے ایک شخص کو اولاد کی خواہش ہو مگر نکاح کا قصد[۴] نہ ہو یا کنواں کھودنا چاہے اور ہاتھ نہ ہلائے یہ لوگ احمق کہلائیں گے۔ ان کے دماغ میں مالیخولیا[۵] سمجھا جائے گا۔ ہاں نکاح کر کے اولاد کی امید رکھنا، پھاوڑا چلا کر کنویں کے پانی کا انتظار کرنا یہ رجاء ہے اب آپ دیکھ لیجیے کہ دین کے بارہ میں ایسے لوگ کتنے ہیں جو اسباب کو جمع کر کے امیدوار ہوئے ہیں ایسے بہت ہی کم ہیں اکثر تو محض غرور میں مبتلا ہیں۔ سالکین[۶] کی حالت یہ ہے کہ بعض لوگ دین کے طالب بن کر شیخ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت گناہوں سے نفرت نہیں ہوتی کچھ توجہ فرما دیجیے غنیمت ہے کہ یہ لوگ عمل کو کچھ تو ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے گناہوں سے نفرت کا اہتمام بھی ہے مگر یوں چاہتے ہیں کہ ہمیں خود کچھ نہ کرنا پڑے سارا کام توجہ سے چل جائے اگر توجہ سے اس طرح کام چلا کریں تو پھر نکاح بھی نہ کیا ہوتا بس توجہ کرالی ہوتی اسی سے پلا پلایا بچہ تم کو مل جاتا۔ واہیات۔ خوب سمجھ لو کہ کام قاعدہ ہی سے ہوتا ہے نری توجہ سے کام نہیں چلا کرتا سو[۷] قاعدہ کی رو سے گناہوں سے بچنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہے، چند دنوں ہمت کر کے دیکھو ان شاء اللہ گناہ خود ہی کم ہو جائیں گے اور جب تم ہی ہمت نہ کرو تو توجہ کیا کرلے گی۔

۱۔ خدا کی مدد ۲۔ بغیر ۳۔ امید ہے ۴۔ ارادہ ۵۔ پاگل پن
۶۔ شریعت کے رستوں پر چلنے والے ۷۔ پس

ترک گناہ کے لیے نفرت عقلی کافی ہے

ور اگر کسی کو شبہ ہو کہ ہمت بھی کی اور گناہوں سے اس وقت بچ بھی گئے مگر گناہوں سے نفرت نہیں ہوتی تو ہمت بھی اس کی تدبیر نہ نکلی تو اس کی حقیقت سمجھ لو وہ یہ کہ ہمت کے لیے گناہوں سے نفرت عقلی لازم ہے نفرت طبعی لازم نہیں اس غلطی میں بہت سے سالکین مبتلا ہیں کہ وہ گناہوں سے نفرت طبعی کو لازم سمجھتے ہیں کہ بس کبھی دل پر وسوسہ بھی نہ آئے اسی لیے ہمت کے بعد اپنے کو ناکام سمجھتے ہیں سو یہ بالکل غلط خیال ہے وسوسۂ گناہ کے مقتضاء[۱] پر عمل نہ کرنا ضروری ہے۔ بلاقصد وسوسہ کا آنا یا میلان ہونا کچھ مضر نہیں اگر مقتضاء پر عمل نہ ہو تو چاہے لاکھ خطرات آتے ہوں اور کیسے ہی گندے وسوسے آتے ہوں واللہ وہ شخص ولی کامل ہے البتہ اگر وسوسہ کے ساتھ اس کے مقتضا پر عمل بھی ہوتا ہو تو یہ اس کی دلیل ہے کہ اس شخص کو گناہوں سے نفرت عقلی بھی نہیں اس کے علاج کی بیشک ضرورت ہے اور وہ ہمت ہے جس کی تقویت کا طریقہ یہ ہے کہ آیات عذاب ووعید میں غور کرے اور وقت موت اور عذاب قبر اور میدان حشر کا تصور کیا کرے پھر سوچے کہ گناہوں سے موت کے وقت سخت پریشانی ہوگی۔ قبر میں عذاب ہوگا۔ قیامت میں سب کے سامنے ذلت و رسوائی ہوگی اور دوزخ کا عذاب الگ بھگتنا ہوگا روزانہ ایک وقت میں یہ مراقبہ اور تصور کیا کرے اور روزانہ کے اعمال کا محاسبہ کرکے گناہوں سے سچی توبہ کیا کرے اس سے چند روز میں ہمت میں قوت ہو کر نفس کی مخالفت سہل[۲] ہو جائے گی۔

وساوس کا آنا مضر نہیں

اب تم اس کی فکر میں نہ پڑو کہ وسوسے تو اب بھی آتے ہیں۔ وساوس کا آنا

۱۔ گناہ کے تقاضے پر عمل نہ کرنا ضروری ہے ۲۔ آسان

کچھ مضر نہیں اور ان کا قطع کرنا تمہارے اختیار سے باہر ہے تم اس کے مکلف[1] نہیں ہو۔ رہا یہ سوال کہ یہ وساوس گو مضر نہیں مگر نہ آتے تو اچھا تھا یہ کیوں آتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس واسطے آتے ہیں کہ حق تعالیٰ تم کو اجر عظیم دینا چاہتے ہیں اگر تم کو گناہوں کا خطرہ بھی نہ آیا کرتا تو پھر ان سے بچنے میں تمہارا کیا کمال تھا نامرد اگر زنا نہ کرے تو کیا کمال ہے اور اب گناہوں سے بچنے میں تمہارا کمال ظاہر ہوتا ہے کہ وسوسے آتے ہیں خیالات تنگ کرتے ہیں اور تم سب کی مخالفت کرتے ہو اور اسی لیے انسان فرشتوں سے افضل ہے اگر اس میں گناہوں کا تقاضا بھی نہ ہوتا تو پھر اس میں اور فرشتوں میں فرق ہی کیا ہوتا۔ مولانا فرماتے ہیں

شہوت دنیا مثال گلخن است — کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

(شہوت دنیا مثل کوڑے کرکٹ کے ہے کہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

سبحان اللہ کیا عجیب تعلیم ہے فرماتے ہیں کہ شہوت دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے حمام کے لیے خس و خاشاک[2] کہ اگر خس و خاشاک کو حمام جلانے کے کام میں لگایا جاوے تو اس سے حمام روشن ہوتا ہے اور اگر حمام کے کام میں نہ لگایا جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے گھر خراب ہونے کے سوا کچھ فائدہ نہیں تو خدا تعالیٰ نے یہ تقاضا اور یہ وساوس تمہارے اندر اس لیے پیدا کیے ہیں تاکہ تم اس سے تقویٰ کے حمام کو روشن کرو یعنی ان کی مخالفت کر کے ہمت سے ان کے مقتضی پر عمل نہ کرو اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا تقویٰ نہایت لذیذ ہوگا اور اس واسطے یہ تقاضا تم کو نہیں دیا گیا کہ تم اسی سے اپنا گھر بھر لو کہ اس حالت میں تمہارے دل کی وہی حالت ہو جائے گی جو کوڑے کباڑ سے گھر کی حالت ہوتی ہے۔ بس تم کو چاہیے کہ ان وساوس کے آنے سے دلگیر مت[3] ہو اور ساتھ کے ساتھ تقویٰ کے حمام میں ان

۱۔ شریعت نے تمہیں اس کا پابند نہیں فرمایا   ۲۔ گھاس پھوس   ۳۔ دل چھوٹا نہ کرو

کو جلاتے رہو گھر میں جمع نہ کرو۔ دوسرا نفع یہ ہے کہ تقویٰ میں نشاط و سرور[1] روحانی ان خطرات ووساوس ہی کے بعد حاصل ہوتا ہے اگر تم بازار میں جاؤ اور کوئی عورت تمہارے سامنے سے نہ گذرے تو تم کو نہ گناہ ہوا نہ کچھ خاص نشاط روحانی حاصل ہوا۔ اور اگر کوئی عورت سامنے سے جاتی ہوئی ملی مگر تم نے اس کی طرف نظر نہ کی تو اس وقت اگرچہ تم کو ایک کلفت[2] ہوگی مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک خاص سرور و نشاط حاصل ہوگا جب چاہے تجربہ کر کے دیکھ لو اس وقت تم بزبان حال یوں کہو گے۔

للہ الحمد نمردیم ورسیدیم بدوست   آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

(خدا کا شکر ہے کہ ہم نہ مرے اور دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفریں ہو)

اس تقاضے کی مثال ایسی ہے جیسے کھانے میں نمک مگر تم اس سے ایسے گھبراتے ہو جیسے مثل مشہور ہے کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے کہا میری آنکھیں ہی پھوڑدیں تو جس طرح نمک کھانے میں اعتدال کے ساتھ ہو تو کھانا لذیذ ہوتا ہے اسی طرح اس تقاضے سے بھی تقویٰ لذیذ ہوجاتا ہے بشرطیکہ اعتدال کے ساتھ ہو ورنہ زیادہ نمک سے کھانا کڑوا بھی ہوجاتا ہے اور اسی لیے جوان کا تقویٰ بوڑھے کے تقویٰ سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے جوان کو تقویٰ میں بوڑھے سے زیادہ نشاط و سرور روحانی حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ بوڑھے کو نہ خطرات آتے ہیں نہ وساوس تو اس کو تقوے کی لذت کی کیا خبر ہو اور جوان بے چارہ ہزاروں خطرات و وساوس کا مقابلہ کر کے ان سے بچتا ہے تو اس کو تقوے کا مزہ معلوم ہوتا ہے جیسے ایک تو وہ شخص جو دریا کے کنارہ پر کھڑا ہے کبھی دریا میں گرنے کی اسے نوبت

۱۔ فرحت اور روحانی خوشی   ۲۔ پریشانی

ہی نہیں آئی اسے کنارہ کی سلامتی کی کیا قدر ہو۔ اور ایک وہ شخص ہے جو دریا میں گر پڑا تھا۔ ڈوبنے کو ہو گیا تھا پھر وہاں سے ہاتھ پیر مار کر غوطہ کھا کر نکل آیا تو اس کی لذت کا حال اب نہ پوچھو عارف شیرازی اسی کو فرماتے ہیں۔

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل

کجا دانند حال ما سبک ساران ساحل ہا

(حیرت میں ہماری حالت ایسی ہے جیسے اندھیری رات ہو اور موج کا خوف ہو اور ہولناک بھنور میں کشتی آ گئی ہو ہمارے اس حال کی ان لوگوں کو کب خبر ہو سکتی ہے جو ہلکے پھلکے کنارے پر کھڑے ہیں دریا میں قدم نہیں رکھا)۔

پھر جب ایک شخص دریا سے نجات پا کر باہر آتا ہے تو یہ اپنے ہاتھ پیروں کو بوسہ دیتا ہے اور ان کی قدر کرتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے میں ہلاکت سے بچ گیا۔

اسی طرح جب سالک مجاہدہ کر کے تقویٰ اختیار کرتا اور مقصود میں کامیاب ہو جاتا ہے تو بعد میں اس کو بھی اپنے جسم و جان سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ ان کی بڑی قدر کرتا ہے کہ میں انہی کے ذریعہ سے محبوب تک پہنچا ہوں اب ان کی خدمت کرنی چاہیئے کیونکہ مجاہدات و ریاضات میں یہ سب کچھ چکنا چور ہو گئے ہیں۔ پس وہ بزبان حال یوں کہتا ہے۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرے جمال کو دیکھا ہے اور اپنے پاؤں پر رشک ہے کہ تیرے کوچہ میں پہنچے ہیں ہر دم اپنے ہاتھوں کو ہزاروں بوسے دیتا ہوں کہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

یہی وجہ ہے کہ مسلمان جنت میں پہنچ کر کہیں گے۔ الحمدللّٰہ الذی

اذهب عنا الحزن۔ ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا دارالمقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیھا نصب ولا یمسنا فیھا لغوب"[1]۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم سے مشقت و رنج کو دور کیا ہے بے شک ہمارا پروردگار بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے جس نے ہم کو ہمیشہ رہنے کے گھر میں پہنچادیا (محض) اپنے فضل سے جہاں ہم کو نہ مشقت چھو سکتی ہے نہ خستگی[2] تو بات یہ ہے کہ مسلمان کو تو پوری راحت جنت میں ہی جا کر نصیب ہوگی دنیا میں تو وہ ہر وقت معصیت[3] سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں کوئی کام خلاف رضائے[4] حق نہ ہوجائے جب یہ مصائب جھیل کر وہ جنت میں پہنچیں گے تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہ ثنا[5] نکلے گی۔ اس وقت ان کو اپنے تمام اعضا کی پوری قدر ہوگی اور ان کو خوب راحت پہنچائیں گے کہ لو تم نے دنیا میں بہت مجاہدات و ریاضات کیے ہیں اب آرام حاصل کرو۔ اور جس نے غم ہی نہ دیکھا ہو وہ جنت کی کیا قدر کرسکتا ہے حدیث میں آتا ہے کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے تو جنت و دوزخ دونوں حق تعالیٰ سے شکایت کریں گی کہ ہم تو خالی رہ گئے ہم کو پر کیجیے تو اس وقت دوزخ کو تو حق تعالیٰ اپنی قدرت سے ویسے ہی بھر دیں گے عجب نہیں کہ اس کے اجزاء سمٹ جائیں اور جنت کے لیے نئی مخلوق پیدا کریں گے تو میں نے اس حدیث کو پڑھ کر حضرت استاد سے عرض کیا کہ حضرت وہ بڑے مزے میں ہوں گے کہ نہ کچھ کیا نہ کرایا مفت میں جنت لے لی مولانا نے فرمایا کہ وہ کیا خاک مزہ میں ہوں گے وہ تو یہ سمجھیں گے کہ جس طرح کی راحت میں ہم ہیں راحت ایسی ہوتی ہوگی اس لیے بس ان کو جنت کی کیا قدر ہوگی۔ اور ہم لوگ دنیا کے مصائب جھیل کر جب

۱۔ فاطر آیت: ۳۴-۳۵ ۲۔ کمزوری ۳۔ گناہ
۴۔ اللہ کی مرضی کے خلاف ۵۔ بلا اختیار اللہ کی تعریف نکلے گی

جنت میں جائیں گے تو ہم کہیں گے۔ "الحمدلله الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور"۔ (اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے مشقت و رنج کو دور کیا بے شک ہمارا پروردگار بہت بخشنے والا قدر دان ہے) یہ بات ان کو کہاں نصیب۔

ایک مرتبہ مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری کی دعوت دہلی کے ایک شہزادے نے کی ایسے ایسے کھانے پکائے جن کا نام بھی مولانا نے نہ سنا تھا پھر کھانے کے بعد وہ شہزادے مولوی صاحب سے پوچھنے لگے کہ مولانا یہ کھانے کیسے پکے مولانا نے فرمایا کہ ہم کو کیا خبر کیسے پکے ہم نے تو یہ کھانے آج ہی کھائے ہیں ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح پکتے ہوں گے، ہاں کئی بار دعوت کرو اور یہی کھانے کھلاؤ تو اس وقت فرق معلوم ہو کہ پہلی بار ایسے پکے تھے دوسری بار ایسے پکے۔ شہزادے نے کہا اچھا آئندہ بھی دعوت کی جمالی بہتر ہے پھر بھی کھلاؤں گا حقیقت میں راحت کی قدر مصیبت والا ہی سمجھ سکتا ہے۔

وسوسہ کے آنے پر اجر ملتا ہے

اسی طرح یہ لوگ مزہ میں ہیں جن کو خطرات و وساوس پیش آتے ہیں۔ ان کو جب دولت تمکین عطا ہوتی ہے تو ان کو اس دولت کی قدر ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن کو خطرات پیش نہیں آئے اور ان کو اس وقت لذت و سرور روحانی بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ غرض گناہوں سے نفرت عقلی مطلوب ہے طبعی نفرت مطلوب نہیں اگر عقلاً تو نفرت ہو اور طبعاً رغبت ہو جس کی علامت یہ ہے کہ تقاضہ کا ورود[1] ہو لیکن مقتضیٰ پر عمل نہ ہو تو یہ وسوسہ کا درجہ ہے اس سے پریشان نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اس سے اجر بڑھتا ہے حدیث میں یہ مضمون موجود ہے کہ صحابہؓ

۱۔ طبیعت میں تقاضا گناہ تو پیدا ہو لیکن اس تقاضے پر عمل نہ ہو کہ گناہ کا مرتکب ہوجائے تو یہ وسوسہ کا درجہ ہے

نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ بعض دفعہ ہمارے دل میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہوجانا پسند کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا "ذاک صریح الایمان" یہ تو خالص ایمان کی علامت ہے۔ مگر آج کل لوگ درخواست کرتے ہیں کہ ہم سے وساوس قطع ہوجائیں اور ہم کو گناہوں سے طبعی نفرت ہوجائے حالانکہ حضور ﷺ اس کو صریح الایمان فرما رہے ہیں۔ اس میں ہزاروں سالک مبتلائے غم ہیں۔

عمل کے اہتمام کی ضرورت

بعض لوگ مشائخ کے پاس آتے ہیں کہ حضور دعا کیجیے ہم مقبول ہوجائیں مگر خود مقبول بننے کے کام نہیں کرتے تو بڑی غلطی ہے اور دین دار بکثرت اس مرض میں پھنسے ہوئے ہیں صاحبو! پہلے تم بھی تو مقبول ہونے کی کوشش کرو اور ایسے کام کرو جو مقبولیت کا ذریعہ ہیں پھر شیخ کی دعا سے بھی نفع ہوگا مگر اب تو یہ اندھیر ہے کہ صرف دعا سے مقبول بننا چاہتے ہیں۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو جنت کا طالب نہ ہو قرب خداوندی کا طلب گار نہ ہو خدا کی محبت و معرفت کا خواہش مند نہ ہو مگر اس کے طرق[1] کو اختیار نہیں کرتے حق تعالیٰ نے اس غلطی پر اس آیت میں تو بطریق عموم[2] متنبہ فرمایا ہے۔ "واتوا البیوت من ابوابھا" (گھروں میں دروازوں سے آؤ) اور دوسری جگہ بطریق خصوص بھی متنبہ فرمایا ہے یعنی خاص دخول جنت کے بارہ میں صراحۃً ارشاد ہے کہ نری تمنا اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا تم کو عمل کا اہتمام چاہیے چنانچہ فرماتے ہیں۔ "لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتب من یعمل سوءً یجزبہ ولا یجدلہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرا. و من یعمل من الصالحات من ذکر او انثیٰ وھومؤمن فاولئک یدخلون الجنۃ ولا

۱۔ طریقوں ۲۔ عام قاعدے سے متنبہ فرمایا ہے

یظلمون نقیراً[۱]۔

شان نزول آیت کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہود اور اہل اسلام میں قبلہ کے تقدم[۲] وتاخر پر تفاخر ہورہا تھا۔ یہود کہتے تھے کہ ہمارا قبلہ مقدم ہے۔ مسلمان کہتے تھے ہمارا قبلہ مقدم ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ خدا کا قرب اور دخول جنت نہ تمہاری تمناؤں سے حاصل ہوسکتا ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے بلکہ ہمارے یہاں تو یہ قانون ہے کہ جو کوئی براکام کرے گا اس کو اس کی سزا بھی بھگتنی پڑے گی اور جو نیک کام کرے گا اس کو جنت ملے گی تو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے عمل کا اہتمام کرو۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوگیا کہ نری[۳] تمنا سے کام نہیں چل سکتا اور نری تمنا کا درجہ وہی ہے جس کے ساتھ عمل کا اہتمام نہ ہو معلوم ہوا کہ مقصود اعمال ہیں ان کو اختیار کرنا چاہئیے اس کے بعد جو تمنا ہوگی وہ رجاء کا درجہ ہوگا خلاصہ یہ کہ جب عمل کا مقصود ہونا ثابت ہوگیا تو اس کا اہتمام سب مسلمانوں کو کرنا چاہئیے۔

عمل پر استقامت اہل اللہ کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے

رہا اس کا طریق تو اس کے لیے ساری شریعت موجود ہے شریعت سے پوچھ پوچھ کر عمل کرو۔ اور اعمال پر مداومت واستقامت کی سہولت اور ان کی اصلاح وتکمیل یہ موقوف ہے اہل اللہ کی صحبت[۴] پر چنانچہ اسی آیت "لیس بامانیکم الی آخرھا" کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے۔ "ومن احسن دیناً ممن اسلم وجھہ للہ وھومحسن واتبع ملۃ ابراھیم حنیفاً[۵]۔ اور اس شخص سے اچھا

۱۔ النساء، آیت: ۱۲۳۔۱۲۴ ۲۔ قبلے سے پہلے اور پیچھے ہونے پر فخر کیا جارہا تھا

۳۔ صرف ۴۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ اس سے ہمیشہ اچھے اعمال ہوں اور وہ اس پر قائم رہے تو اس کے حاصل کرنے کا طریقہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا ہے ۵۔ النساء، آیت: ۱۲۵

کون ہے جو اپنی ذات کو خدا کے سپرد کردے دراں حالیکہ وہ صاحب اخلاص ہو اور ملۃ ابراھیم کا متبع ہو۔ جو کہ حنیف تھے یعنی ماسوائے اللہ سے یکسو تھے۔ یہاں اسلام وجہ سے مراد فنا ہے کیونکہ کامل سپردگی اسی سے ہوتی ہے جس کے بعد نسبت احسان عطا ہوجاتی ہے چنانچہ وھو محسن میں نسبت احسان ہی کی طرف اشارہ ہے۔ مقام اخلاص جب کامل ہوجاتا ہے تو اسی کو نسبت احسان سے صوفیہ کی اصطلاح میں تعبیر کیا جاتا ہے[1]۔

آگے بتلاتے ہیں کہ یہ دولت کس طرح حاصل ہوگی ارشاد ہے "واتبع ملۃ ابراھیم حنیفا"۔ یعنی جو شخص ملۃ ابراھیم کا اتباع کرے گا اسے یہ دولت عطا ہوگی اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اتباع ابراہیم علیہ السلام سے یہ نعمت عطا ہوگی حتی کہ یہ شبہ ہو کہ بس جو لوگ ابراہیم علیہ السلام کی امت میں نہیں ان کو یہ دولت نہ ملے گی بلکہ اتباع ملۃ ابراھیم پر اس نعمت کو موقوف کیا گیا ہے جس سے مراد ان کے مذاق کا اتباع ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کا مذاق فنا تھا۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ "ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم الا من سفہ نفسہ ولقد اصطفیناہُ فی الدنیا وانہ فی الاخرۃ لمن الصالحین اذقال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العلمین"[2]۔ (ملت ابراہیم سے وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کرلیا ہے اور اسی کی بدولت وہ آخرت میں بڑے لوگوں میں سے شمار کیے جاتے ہیں اور جب ان سے ان کے رب نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے رب العالمین کی اطاعت اختیار کی)۔

اور یہ دولت ہر نبی کو عطا ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس کا

۱۔ جیسا کہ حدیث جبریل میں ہے ما الاحسان قال ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک یعنی تم اللہ کی عبادت ایسے کرو جیسا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو پس تم اگر نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو دیکھ رہا ہے

۲۔ البقرہ، آیت: ۱۳۰

ظہور سب سے زیادہ کامل تھا پس ہمارے لیے ملت ابراہیمیہ کے اتباع کا تحقق اتباع محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صورت میں ہوگا۔ حاصل یہ ہوا کہ یہ دولت کسی فانی[1] کے اتباع سے حاصل ہوگی۔ بدون کسی فانی کے اتباع کے تکمیل اعمال نہیں ہوسکتی۔ رہا یہ کہ پھر اتباع فانی کے بعد کیا ہوگا آیا صرف استقامت ہی عطا ہوجائے گی یا اس سے بھی زیادہ کچھ ملے گا۔ اس بابت ارشاد ہے۔ "واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً" کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو مذاق فنا کی بدولت خلیل بنالیا تھا تو سمجھ جاؤ کہ جو شخص کسی فانی کا متبع ہوگا اسے دولت خلت[2] عطا ہوگی میرے ذوق میں اس جملہ کے اندر اتباع فانی کی جزا کا ذکر ہے مگر صراحۃً نہیں بلکہ اشاروں میں بیان کیا ہے کیونکہ۔

خوشتر آن باشد کہ سر دلبراں — گفتہ آید در حدیث دیگراں

(محبوب کے ایسے راز کا دوسروں کی حکایت اور تمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے)

حاصل یہ ہوا کہ جس کو مقاصد دینیہ کی طلب ہو وہ عمل کا اہتمام کریں اور تکمیل عمل کے لیے صحبت اہل اللہ کو لازم سمجھے یہ طریقہ ہے کامیابی کا میں نے قاعدہ کلیہ بتلادیا ہے جزئیات کی تفصیل مجالس عرفاء میں ہوتی رہتی ہے۔

اگر شیخ میسر نہ ہو تو کس کی صحبت اختیار کرے

اگر صحبت عارفین میسر ہوجائے تو بسا غنیمت ہے[3]۔

مقام امن و مے بیغش و رفیق شفیق — گرت مدام میسر شود زہے توفیق

(مقام امن اور خالص شراب محبت اور شفیق رفیق اگر تم کو ہمیشہ میسر ہوجائیں تو

۱۔ جس کو فنافی اللہ کا مقام حاصل ہو

۲۔ مقام خلیل اللہ عطا ہوگا خلت اس محبت کو کہتے ہیں جو دل کے اندر گھر کی ہوئی ہو

۳۔ اور اگر صحبت میسر نہ ہو تو ان کی تصنیفات پڑھ کر بھی فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے چاہے کم ہی ہو

بہت ہی اچھی توفیق ہے)

اور مطالعہ ملفوظات کے متعلق فرماتے ہیں۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است ‏ ‏ ‏ صراحیٔ مے ناب و سفینۂ غزل است

(جو زمانہ شیخ سے خالی ہو اس میں اس کے مکتوبات اور ملفوظات سے مستفید ہو)

دیکھئے حضرت حافظؒ کتاب کو بھی رفیق فرما رہے ہیں اور شیخ کا رفیق ہونا اوپر کے شعر سے معلوم ہو چکا ہے نیز اس کا رفیق ہونا ہر ایک کو معلوم ہے کہ وہ معین آخرت ہوتا ہے اور حضرت حافظ کے کلام سے کتاب کا بھی رفیق ہونا معلوم ہو گیا۔ باقی فضول مجلس آرائیوں کو چھوڑنا چاہیئے اس سے آخرت کا بہت ضرر[1] ہوتا ہے اور اگر کسی شخص کو کسی موقع پر کسی عارف کی خدمت نصیب نہ ہو نیز اور دو کتب[2] بینی سے گھبرا جاوے اور کچھ دیر اپنا دل بہلانا چاہے تو بجائے چوپال اور مجالس میں بیٹھنے کے اس کو اپنے بیوی بچوں میں دل بہلانا چاہیئے اس میں باطن کا ضرر نہیں ہوتا کیونکہ اہل و عیال کی دلجوئی بھی سنت ہے۔ ایک عارف کہتے ہیں۔

جہد سے کن و با مردم دانا بنشیں + با صدق و صفا

یا با صنم لطیف و رعنا بنشیں + با شرم و حیا[3]

(اس سے مراد زوجہ ہے یعنی یا تو شیخ کی صحبت میں رہو اگر شیخ میسر نہ ہو تو بیوی کے پاس بیٹھو اس سے بھی حفاظت رہتی ہے)

زیں ہر دو گرت یکے میسر نشود + از طالع خویش

اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں + در یادِ خدا

(اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی میسر نہ ہو تو تنہا یادِ خدا میں بیٹھو)

۱۔ نقصان ‏ ‏ ۲۔ کتابیں دیکھنے اور وظیفے پڑھنے ‏ ‏ ۳۔ کوشش کرو اور عقل مند آدمی کے پاس صفائی اور سچائی کے ساتھ بیٹھو یا اگر وہ نہ ملے تو پھر شرم و حیا کے ساتھ اچھی بیوی کے پاس بیٹھو

یہ طریقہ ہے آجکل سلامتی کا اور اس کے سوا اور جو تدبیریں سلامتی کی جاتی ہیں سب میں فتنہ ہے۔

گر گریزی بر امید راحتے ہم ازانجا پیشت آید آفتے

(اگر کسی راحت یا آرام کی امید پر بھاگتا ہے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

واقعی آجکل جن لوگوں کو دوست سمجھا جاتا ہے ان ہی میں سے دشمن نکل آتے ہیں اس لیے اب مخلوق سے ملنے ملانے اور مجلس آرائی کرنے کا زمانہ نہیں رہا انسان اپنے کام میں لگا رہے دنیا کے یا دین کے اور اس کے بعد جو وقت بچے اسے خدا کی یاد میں گذارے کچھ دیر بال بچوں میں دل بہلائے کچھ وقت کتب بینی کے واسطے نکال لے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ کنجے بے دو و بیدام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے خلوت گاہ حق کے سوا کسی جگہ آرام نہیں ہے)

پس دنیا و آخرت کی راحت و چین کا طریقہ میں نے آپ کو بتلا دیا ہے میں اس وقت حجت اللہ ختم کر چکا ہوں آگے عمل کرنا نہ کرنا سامعین کے اختیار میں ہے۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کیونکہ بدون ان کی امداد کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ ہم کو ظاہری و باطنی بیماریوں سے شفا دے اور ہماری اصلاح فرمائے اور ہم کو عمل کی توفیق دے آمین۔ والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علی سیدالمرسلین سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

تمت